تعمیرِ حیات
پندرہ روزہ

اسّی سال قبل کی ایک تحریر

" بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک جماعت علماء کی دنیا کے حالات اور واقعات سے بھی باخبر ہو۔ اس کو معلوم ہو کہ جس سلطنت میں وہ بسر کرتی ہے اس کے اصول سلطنت کیا ہیں۔؟ اس کو اس حکومت سے کس قسم کا تعلق ہے،

مسلمانوں کی دنیوی حالت کیا ہے، ان کو کیا ضرورتیں درپیش ہیں، سلطنت کے انتظامات میں جو تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں، اُن سے مسلمانوں کی حالت پر کیا اثر پڑتا ہے۔

ملک میں علماء کا جو اثر کم ہوتا جارہا ہے، اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ، یہ خیال عام طور پر پھیلتا جاتا ہے کہ علماء حجروں میں معتکف ہیں اور ان کو دنیا کے حال سے بالکل خبر نہیں، اس لئے دنیاوی معاملات میں ان کی ہدایت اور ان کا ارشاد بالکل ناقابل التفات ہے۔

بے شبہ جو علماء دنیا سے بالکل ہاتھ دھو بیٹھے ہیں اور ان کو کثرتِ عبادت اور ذکر و فکر کی وجہ سے اپنے زن و فرزند کی ضروریات کی طرف بھی توجّہ نہیں، اصحاب صفّہؓ سے ان کو تشبیہ دی جاسکتی ہے، لیکن ظاہر ہے کہ کل صحابہ کرامؓ اصحاب صفّہؓ نہیں تھے، اور نہ ہو سکتے تھے۔

بے شبہ اصحاب صفّہؓ کے مشابہ ایک گروہ ہمیشہ قوم میں موجود رہنا چاہیئے، لیکن اس کے ساتھ نہایت ضروری ہے ایک جماعت کثیر ایسی بھی موجود ہو جو واقفیت و اطلاع، انتظام و تدبیر، حزم و مصلحت اندیشی میں حضرت عمرؓ، حضرت عمرو بن العاصؓ، خالد بن ولیدؓ اور ابو عبیدہؓ کے نقش قدم پر ہو۔"

مولانا محمد علی مونگیری

(بانی ندوۃ العلماء)

Regd No. LW/NP 56
Phone:- 22948
29747
TAMEER-E-HAYAT
Fortnightly
(NADWATUL-ULAMA LUCKNOW-226007 (INDIA)

تعمیرِ حیات

لکھنؤ

پندرہ روزہ

شعبۂ تعمیر و ترقی دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

جلد نمبر ۱۵ | ۲۵ جولائی ۱۹۷۸ء ــــ ۱۸ شعبان المعظم ۱۳۹۸ھ | شمارہ نمبر ۱۸

زرِ اشتراک اندرون ہند مع محصول ڈاک:
سالانہ: ۱۲ روپے۔ ششماہی: سات روپے
فی پرچہ: ۶۰ پیسے
بیرون ہند مع محصول ڈاک:
بحری ڈاک سے: ایک پاؤنڈ ۶ شلنگ
ہوائی ڈاک سے، امریکہ و کناڈا اور یورپین ممالک: ۳ پونڈ
افریقہ، مشرق وسطیٰ اور مشرق بعید کے ممالک: ۲ پونڈ
پاکستان: ۳۰ روپے ــ بنگلہ دیش: ۱۵ روپے

اسحٰق جلیس ندوی

حیاتِ نو کا پیامبر

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ایک معتمد اور مخلص، ایک بڑے عرب سردار احنف بن قیس نے ایک دن کسی قاری کو قرآن مجید کی یہ آیت تلاوت کرتے ہوئے سنا:

"ہم نے تمہاری طرف ایک ایسی کتاب نازل کی جس میں تمہارا تذکرہ موجود ہے، تم غور و فکر سے کام نہیں لیتے۔"

آیت سُن کر وہ چونک پڑے اور قرآن مجید میں اپنا تذکرہ تلاش کرنے لگے، آیتیں ان کی نظر سے گذرتی رہیں، کہیں ذکر تھا:

"وہ لوگ رات کو بہت کم سوتے تھے اور آخر شب میں استغفار کیا کرتے تھے۔ اور ان کے مال میں سائل اور محروم کا حق تھا۔" (الذاریات)

کچھ لوگوں کا یہ حال درج تھا:۔

"ان کے پہلو خواب گاہوں سے علیحدہ ہوتے ہیں، وہ لوگ اپنے رب کو پکارتے ہیں، امید اور خوف سے اور ہماری دی ہوئی چیزوں میں سے خرچ کرتے ہیں (حٰم السجدہ)

اور پھر کچھ ایسے کہ:۔

"وہ راتوں کو اپنے رب کے آگے سجدے اور قیام میں لگے رہتے ہیں۔" (الفرقان)

کچھ لوگوں کا یہ عالم کہ:۔

"وہ دوسروں کو اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ ان کو تنگی اور فاقہ ہو۔ (الحشر)

خدا کے مقبول بندوں کے اعلیٰ معیار کا جو نقشہ انہوں نے قرآن مجید میں دیکھا اور پھر اپنے کو ٹٹولا تو پکار اٹھے:۔ "خدایا! میں تو ان میں کہیں نظر نہیں آتا، میں تو اس معیار پر پورا نہیں اترتا۔" انہوں نے اپنی تلاش جاری رکھی، تصویر کا دوسرا رخ سامنے آیا:۔

"جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں تو تکبر کیا کرتے اور کہتے کہ کیا ہم اپنے معبودوں کو ایک شاعر و دیوانہ کی وجہ سے چھوڑ دیں گے۔"

کچھ لوگوں کے بارے میں تھا:۔

"جب فقط اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل منقبض ہو جاتے ہیں، اور جب اس کے سوا دوسروں کا ذکر آتا ہے تو اس وقت وہ لوگ خوش ہو جاتے ہیں۔" (الزمر)

دوزخ میں داخل کچھ بدقسمتوں کے اعتراف کا ذکر تھا کہ:۔

"ہم نہ تو نماز پڑھتے تھے اور نہ غریب کو کھلایا کرتے تھے اور ہم باتیں بنانے والوں کے ساتھ خود بھی مشغول ہو جاتے تھے اور ہم آخرت کا انکار کرتے تھے، یہاں تک کہ ہم کو موت آگئی۔" (المدثر)

احنف نے کہا۔ "خدایا یہ بھی میری تصویر نہیں، میں ایسے لوگوں سے بیزار ہوں۔" انہوں نے اپنی تلاش جاری رکھی اور آخرکار خدا کی کتاب میں اپنے کو پانے میں کامیابی حاصل کر لی:۔

"اور کچھ لوگ ایسے ہیں جن کو اپنی خطاؤں کا اقرار ہے، انہوں نے ملے جلے عمل کئے تھے، کچھ بھلے، کچھ برے، اللہ سے امید ہے کہ ان کے حال پر رحمت کے ساتھ توجہ فرمائے، بلاشبہ اللہ بڑی مغفرت والا، بڑی رحمت والا ہے (توبہ)

احنف بن قیس کو یہ تذکرہ اپنی زندگی کا حقیقی عکاس نظر آیا، وہ پکار اٹھے "خدایا! میں تیرا ایسا ہی بندہ ہوں، طاعت کی طرف قدم بڑھانے والا لیکن غفلت و معاصی کا مرتکب بھی، مجھے اپنی خطاؤں کا اعتراف ہے، لیکن میں تیری رحمت سے مایوس نہیں۔"

قرآن مجید میں احنف بن قیس کو اپنی جھلک جن آیات میں نظر آئی، یہ حال نوے فیصد اہل ایمان کا ہے۔ ثواب طاعت و زہد کو جانتے ہوئے بھی نفس اور تقاضوں سے مغلوب ہو کر غفلت کے شکار۔

لیکن دامن رحمت کی وسعت ہر لمحہ یاسیت سے بچاتی اور اپنے میں سمیٹ لینا چاہتی ہے، ع۔ "رحمت حق بہانہ می جوید" کی گردش کا ہر لمحہ خاص طور پہ وہ وقت جب مالک کائنات سماء دنیا سے مغفرت کے طالبوں کو خود ندا دیتا ہے،

ماہ سال کی گردش میں بھی ایسے ایام آتے ہیں جب شیطان کو پابہ زنجیر کیا جاتا ہے تاکہ بندہ اس کے شر سے محفوظ رہ کر اپنے مالک حقیقی کی طرف صمیم قلب سے رجوع ہو۔ اپنے رب کی رضا والی زندگی اپنائے، اور الحاح و زاری سے کہے کہ ؎

بر در آمد بندۂ بگریختہ آبروئے خود بعصیاں ریختہ
بادشاہا جرم مارا درگذار ما گنہگاریم و تو آمرزگار

ماہ رمضان المبارک ہر مسلمان کے لئے اسی حیاتِ نو کا پیام لاتا ہے۔ روح پر گیارہ مہینے تک معصیت اور غفلت کا جو میل کچیل جمع ہو گیا تھا اس کی صفائی کا مہینہ، غفلت و خدا فراموشی کے لباس کو اتار پھینکنے اور ذکر الٰہی اور تقویٰ کے لباس سے آراستہ ہونے کا مہینہ، وہ مبارک مہینہ جس میں دل کی دوا اور روح کی غذا کا ایسا سامان ہے کہ جس سے گیارہ ماہ کی بلکہ برسوں کی روحانی بھوک اور تشنگی رفع ہو جاتی ہے، نیکیوں کے موسم بہار اور نعمت الٰہی کے شکر و اعتراف کا مہینہ، جس مہینہ کا ہر لمحہ بندے کو خدا سے قریب تر کرنے اور برسوں کی مسافت، منٹوں میں طے کرنے میں معاون بنتا ہے۔

اس ماہ مبارک کی برکتوں کے حصول کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ماہ شعبان سے اس کے استقبال کی تیاری فرمایا کرتے تھے، صحابہ کرامؓ، بزرگانِ دینؒ اس کے انتظار کی گھڑیاں گنا کرتے تھے،

آج بھی خدا کے وہ بندے جن کو اپنے مالک حقیقی کی معرفت و محبت اور قرب و تعلق کی نعمت و لذت حاصل ہے، اس ماہ مبارک کے لئے ایسے چشم براہ رہتے ہیں جیسے کسی محبوب مہمان کا انتظار ہو۔

احنف بن قیس کے تذکرے میں ملت کی اکثریت کا تذکرہ ہے، بلکہ ہمارا حال اس سے کہیں ابتر ہے، ہم نظر رحمت کے بہت محتاج ہیں ــــ ماہ مبارک ہمارے لئے ایک مژدۂ جاں فزا اور حیاتِ نو کا پیام بن کر آرہا ہے۔ خدا اس محدود و مختصر زندگی میں ہمیں پھر یہ مبارک مہینہ نصیب فرما رہا ہے۔ ان مبارک روز و شب کو نئی زندگی کے حصول، اللہ کی رضا کی طلب، اس سے مغفرت و بخشش کی التجا، اس کے قرب و تعلق کی تمنا اور جستجو میں صرف کرنے کی توفیق اسی سے طلب کی جائے۔

خدا ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم حیاتِ نو کے پیامبر ان مبارک روز و شب کا کسی درجہ میں حق ادا کر سکیں اور وہ پا سکیں جس کے سراپا محتاج ہیں۔!!

تعلیم القرآن

از: مولانا محمد اویس ندوی مرحوم

مجلس کا ادب

یا ایھا الذین آمنوا اذا قیل لکم تفسحوا فی المجالس فافسحوا یفسح اللہ لکم واذا قیل انشزوا فانشزوا۔ (مجادلہ)

اے مسلمانو! جب تم سے کہا جائے کہ مجلسوں میں کشادگی کرو تو کشادگی کرو، اللہ تمہارے لئے کشادگی کرے گا! اور اگر کہا جائے کہ اٹھ جاؤ، تو اٹھ جاؤ۔

اس آیت میں مجلس میں بیٹھنے کا ادب بتایا گیا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگ کوشش کر کے اسی جگہ پر بیٹھتے ہیں، جو کسی وجہ سے خاص درجہ رکھتی ہے۔ ایسی حالت میں جگہ تنگ ہو جاتی ہے۔ لوگوں کو تکلیف ہوتی ہے! اور اگر ان سے ذرا ہٹنے اور دوسروں کے لئے جگہ بنانے کے لئے کہا جائے تو وہ برا مانتے ہیں، اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کا ادب سکھایا ہے کہ مجلس میں کھل کر بیٹھا کرو، صحابہ کا طریقہ تھا کہ جہاں بے تکلف پہلے جگہ مل جاتی وہاں بیٹھ جاتے! مجمع کو چیر کر آگے بیٹھنے کی کوشش نہ کرتے، مجلس میں کسی کو اٹھا کر اس کی جگہ نہ بیٹھنا چاہیئے! اگر کوئی شخص مجلس میں ایک جگہ بیٹھ کر کسی ضرورت سے خود اٹھ جائے تو پلٹنے کے بعد وہی اس جگہ کا مستحق ہے!

مجلس میں جو معزز جگہ ہے وہاں خود بیٹھنے کی کوشش نہ کرنا چاہیئے، کسی دوسرے کے یہاں جانا ہو تو اس کی اجازت کے بغیر اس کی خاص معزز جگہ پر نہ بیٹھنا چاہیئے۔

گھر میں جانے کا ادب

یا ایھا الذین آمنوا لا تدخلوا بیوتا غیر بیوتکم حتی تستانسوا وتسلموا علی اھلھا ذلکم خیر لکم لعلکم تذکرون۔ فان لم تجدوا فیھا احدا فلا تدخلوھا حتی یوذن لکم وان قیل لکم ارجعوا فارجعوا ھو ازکی لکم۔ (نور ۴)

مسلمانو! اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں گھر والوں سے پوچھے اور ان سے سلام علیک کئے بغیر نہ جایا کرو یہ تمہارے حق میں بہتر ہے (یہ حکم تم کو اس لئے دیا گیا ہے) کہ (جب ایسا موقع ہو تو) تم (اس کا خیال رکھو) پھر اگر تم کو معلوم ہو کہ گھر میں کوئی آدمی موجود نہیں تو جبتک تمہیں (خاص) اجازت نہ ہو وہاں نہ جاؤ، اور اگر گھر میں کوئی ہو اور تم سے کہا جائے کہ (اس وقت موقع نہیں) لوٹ جاؤ تو (بے تامل) لوٹ آؤ یہ (لوٹ آنا) تمہارے لئے زیادہ صفائی کی بات ہے۔

کسی کے گھر میں داخل ہونے کے لئے اجازت کے بہت فائدے ہیں! مگر ان سب میں اصلی بات یہ ہے کہ بعض وقت آدمی ایسی حالت میں ہوتا ہے کہ وہ یہ نہیں چاہتا ہے کہ دوسرے اس کو ایسی حالت میں دیکھیں! ہمارے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی کے گھر جاتے تھے، تو اجازت لینے سے پہلے دروازہ کے داہنے یا بائیں کھڑے ہوتے تھے، سامنے نہیں کھڑے ہوتے تھے، تاکہ اندر کی چیزوں پر نگاہ نہ پڑے۔

ایک مرتبہ ایک آدمی آئے اور آپ کے دروازہ کے سامنے کھڑے ہو گئے! تو آپ نے فرمایا کہ دروازہ کے داہنے یا بائیں کھڑے ہو، کیونکہ اجازت لینے کا حکم اسی لئے دیا گیا ہے کہ گھر کے اندر کی چیزوں پر نگاہ نہ پڑنے پائے۔

اجازت لینے کا طریقہ یہ ہے کہ سلام کر کے کہے کہ میں اندر آ سکتا ہوں، تین بار سلام کرنے کے بعد اگر اجازت نہ ملے تو واپس جانا چاہیئے! البتہ اگر کسی کو خود بلایا جائے تو اجازت لینے کی ضرورت نہیں۔ دوکانوں میں جانے کے اور اسی قسم کی عام جگہوں میں جانے کے لئے اجازت کی ضرورت نہیں۔ خود اپنے گھر کے اندر بھی سلام کر کے جانا چاہیئے۔

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ انکو بار بار اجازت لینے میں زحمت ہوگی، جیسے چھوٹے بچے یا لونڈی غلام یہ ہر وقت گھر میں آتے جاتے رہتے ہیں، اس لئے انکے لئے یہ حکم نہیں ہے، لیکن تین وقت ایسے ہیں کہ ان کے لئے بھی اجازت لینا ضروری ہے! وہ وقت نماز عشاء کے بعد، نماز صبح سے پہلے، اور دوپہر کے وقت۔

محسنِ انسانیتؐ نے فرمایا

روزے کی فضیلت

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ ماہ شعبان کی آخری تاریخ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ایک خطبہ دیا۔ اس میں آپ نے فرمایا۔ اے لوگو۔ تم پر ایک عظمت اور برکت والا مہینہ سایہ فگن ہو رہا ہے۔ اس مہینہ کی ایک رات (شب قدر) ہزار مہینوں سے بہتر ہے۔ اس مہینہ کے روزے اللہ تعالیٰ نے فرض کئے ہیں اور اس کی راتوں میں بارگاہ الٰہی میں کھڑے ہونے (یعنی نماز تراویح پڑھنے) کو نفل عبادت مقرر کیا ہے (جس کا بہت بڑا ثواب رکھا ہے) جو شخص اس مہینہ میں اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کا قرب حاصل کرنے کے لئے کوئی غیر فرض عبادت (یعنی سنت یا نفل) ادا کرے گا تو دوسرے زمانہ کے فرضوں کے برابر اس کو ثواب ملے گا، اور اس مہینہ میں فرض ادا کرنے کا ثواب دوسرے زمانے کے ستر فرضوں کے برابر ملے گا۔ یہ صبر کا مہینہ ہے اور صبر کا بدلہ جنت ہے۔ یہ ہمدردی اور غمخواری کا مہینہ ہے اور یہی وہ مہینہ ہے جس میں مومن بندوں کے رزق میں اضافہ کیا جاتا ہے۔ جس نے اس مہینہ میں کسی روزہ دار کو (اللہ کی رضا اور ثواب حاصل کرنے کے لئے) افطار کرایا تو اس کے لئے گناہوں کی مغفرت اور آتش دوزخ سے آزادی کا ذریعہ ہوگا اور اس کو روزہ دار کے برابر ثواب دیا جائے گا، بغیر اس کے کہ روزہ دار کے ثواب میں کوئی کمی کی جائے ــــ آپ سے عرض کیا گیا کہ یا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم میں سے ہر ایک کو تو افطار کرانے کا سامان میسر نہیں ہوتا (تو کیا غرباء اس عظیم ثواب سے محروم رہیں گے) آپ نے فرمایا، اللہ تعالیٰ یہ ثواب اس شخص کو بھی دے گا جو دودھ کی تھوڑی سی لسّی پر یا پانی کے ایک گھونٹ پر کسی روزہ دار کا روزہ افطار کرا دے (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے آگے ارشاد فرمایا کہ) اور جو کوئی کسی روزہ دار کو پورا کھانا کھلا دے اس کو اللہ تعالیٰ میرے حوض کوثر سے ایسا سیراب کرے گا جس کے بعد اس کو کبھی پیاس نہ لگے گی تاآنکہ وہ جنت میں پہنچ جائے گا۔

(اس کے بعد آپ نے فرمایا) اس ماہ مبارک کا ابتدائی حصہ رحمت ہے اور درمیانی حصہ مغفرت ہے اور آخری حصہ آتش دوزخ سے آزادی ہے اس کے بعد آپ نے فرمایا) اور جو آدمی اس مہینہ میں اپنے غلام و خادم کے کام میں تخفیف و کمی کر دے گا اللہ تعالیٰ اس کی مغفرت فرما دے گا، اور اسے دوزخ سے رہائی اور آزادی دے گا۔ (شعب الایمان للبیہقی۔ معارف الحدیث)

روزہ میں احتساب: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو لوگ رمضان کے روزے، ایمان و احتساب کے ساتھ رکھیں گے ان کے سب گذشتہ گناہ معاف کر دئے جائیں گے۔ اور ایسے ہی جو لوگ ایمان و احتساب کے ساتھ رمضان کی راتوں میں نوافل (تراویح و تہجد) پڑھیں گے ان کے بھی سارے پچھلے گناہ معاف کر دئے جائیں گے، اور اسی طرح جو لوگ شب قدر میں ایمان و احتساب کے ساتھ نوافل پڑھیں گے ان کے بھی سارے پچھلے گناہ معاف کر دئے جائینگے۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم۔ معارف الحدیث)

روزہ کی برکت: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا روزہ رکھا کرو تندرست رہا کرو گے۔ (طبرانی) ــــ اور روزہ سے جس طرح ظاہری و باطنی مضرت زائل ہوتی ہے اسی طرح اس سے ظاہری و باطنی مسرت حاصل ہوتی ہے۔

روزہ کی اہمیت: حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ جب رمضان المبارک کا عشرۂ اخیرہ شروع ہوتا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کمر کس لیتے، اور شب بیداری کرتے (یعنی پوری رات عبادت اور ذکر و دعا میں مشغول رہتے) اور اپنے گھر کے لوگوں (یعنی ازواج مطہرات اور دوسرے متعلقین) کو بھی جگا دیتے (تاکہ وہ بھی ان راتوں کی برکتوں اور سعادتوں میں حصہ لیں)۔ (صحیح بخاری و صحیح مسلم۔ معارف الحدیث)

روزہ چھوڑنے کا نقصان: حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا جو آدمی سفر وغیرہ کی شرعی رخصت کے بغیر اور بیماری جیسے کسی عذر کے بغیر رمضان کا ایک روزہ بھی چھوڑیگا وہ اگر اس کے بجائے عمر بھر بھی روزے رکھے) تو جو چیز فوت ہو گئی وہ پوری ادا نہیں ہو سکتی۔ (مسند احمد۔ معارف الحدیث)

مسلمان اور ہندوستانی پورَوج

ایک اہم اصولی بحث

(ہمارے ملک میں سیاسی قیادت کی تبدیلی اور جنتا پارٹی کی حکمرانی کے بعد، اکثریت کی انتہا پسند تحریکوں کی طرف سے یہ آواز اٹھائی جارہی ہے کہ ہندوستانی مسلمان اپنے نام اپنے نسلی بزرگوں (پورَوج) کے نام پر کیوں نہیں رکھتے؟

اسلامی ناموں کے "ہندی کرن" کی مہم آر، ایس، ایس کے موجودہ سنچالک شری بالا صاحب دیورس نے بڑی حکمت اور مخصوص منطق سے چلائی ہے، گذشتہ دنوں انہوں نے اپنی کئی تقریروں میں یہ بات صراحت سے کہی کہ "طریقہ اعبادت (اُپاسنا پدھتی) کے فرق کے علاوہ بقیہ باتوں میں مسلمانوں کو اکثریت میں مدغم ہوجانا چاہئے تاکہ قومی یکجہتی کو فروغ حاصل ہو، خاص طور پر اپنے ناموں کے سلسلے میں مسلمانوں کو عربی (اسلامی) ناموں پر اصرار نہیں کرنا چاہئے، بلکہ اپنے انڈونیشیائی بھائیوں کی تقلید کرنا چاہئے، جن کے نام اپنے نسلی بزرگوں کے نام پر ہوتے ہیں، انڈونیشیا کے صدر کا نام شوکرن (سوئیکارنو) تھا، اس کی بیوی کا نام رتنا دیوی ہے، وغیرہ"

اسی طرح کی ایک تجویز یوپی کے سابق وزیر اعلیٰ ڈاکٹر سمپورنانند نے ۱۹۶۱ء میں پیش کی تھی، اس کا مسکت جواب مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اس زمانہ میں شائع فرمایا تھا مسئلہ کی اہمیت اور نزاکت کے پیش نظر اس مفید، مدلل مضمون کو ہم شائع کررہے ہیں۔ مولانا کے اس جواب سے ڈاکٹر سمپورنانند بھی متاثر ہوئے تھے۔ اور انہوں نے اس کا اعتراف مولانا کے نام ایک خط میں کیا تھا)۔

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ـ ناظم ندوۃ العلماء لکھنؤ

یوپی کے سابق وزیر اعلیٰ اور مرکزی حکومت کی مقرر کردہ "جذباتی ہم آہنگی" کمیٹی کے چیرمین شری سمپورنانند نے ۹ ستمبر کو لکھنؤ میں پنڈت پنتھ کے یادگار لکچروں کے سلسلہ میں جو تقریر کی، اس کی جو رپورٹ اخباروں میں شائع ہوئی، اس کا ایک اہم ٹکڑا یہ تھا:-

"مسٹر سمپورنانند نے یہ بات زور دے کر کہی کہ ہندوستانی مسلمانوں میں نوے فیصدی سے زیادہ وہ لوگ ہیں جو پہلے ہندوؤں کی اولاد ہیں، جنھوں نے بعد میں اسلام قبول کرلیا تھا، لیکن افسوس ہے کہ وہ اپنے اصل اجداد کے کارناموں سے ناواقف ہیں، وہ ان اجداد سے واقف ہونے کی فکر بھی نہیں کرتے، نہ تو وہ ان کو پہچانتے ہیں اور نہ انکے عظیم کارناموں پر فخر محسوس کرتے ہیں، انہوں نے فرمایا کہ اگر ایرانی مسلمان اپنے غیر مسلم اجداد پر فخر کرسکتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہندوستانی مسلمان اپنے اجداد اور ان کے کارناموں پر فخر نہ کریں، ہندوستانی مسلمانوں کو چاہئے کہ وہ رام، کرشن، اشوک اور دوسرے بڑے ہندوستانی سپوتوں کو اپنا اجداد تسلیم کریں اور ان کی تعظیم کرنا اور ان کے کارناموں پر فخر کرنا سیکھیں"۔

(نیشنل ہیرالڈ، ۱۰ ستمبر ۱۹۶۱ء)

سمپورنانند جی نے اس کے بعد بھی اپنی بعض دوسری تقریروں اور مضامین میں اس خیال کا اعادہ فرمایا، ان کے علاوہ مدھیہ پردیش کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر کاٹجو نے حمیدیہ کالج بھوپال کے منصوبہ بندی ہفتہ کا افتتاح کرتے ہوئے جو تقریر کی اس میں بھی سمپورنانند جی کے خیالات کو دہرایا اور ہندوستان کی واجب الاحترام شخصیتوں کی فہرست میں دو مزید نام، مہارانا پرتاپ اور شیواجی کا اضافہ کیا، انہوں نے بھی یہی بات فرمائی کہ مسلمان دراصل پہلے ہندو ہی تھے، وہ ہمارے پُرکھوں کی اولاد ہیں، انہوں نے حاضرین کو (جن میں بڑی تعداد مسلمانوں کی بھی تھی) مخاطب کرکے کہا کہ سومنات، چتوڑ اور دوسرے استھانوں پر جائیے آپ کے تیرتھ استھانوں کا ندھی ساگر ڈیم وغیرہ کے تیرتھ نامکمل ہیں، اگر آپ نے چتوڑ وغیرہ کی یاترا نہ کی۔

سمپورنانند جی نے جو ایک صاحب علم اور صاحب فکر انسان ہیں اور جو عرصہ تک علمی اور تعلیمی دنیا سے متعلق رہ چکے ہیں اور اس وقت ملک کی اس اہم مجلس کے صدر ہیں، جس کا ہندوستان جدید کی تشکیل میں موثر حصہ ہوگا، یہ بات بار بار سنجیدگی سے کہی ہے کہ اس کو آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، انہوں نے یہ بات علمی اور تاریخی انداز میں کہی ہے، اگر ہم ڈاکٹر کاٹجو کی تقریر کو، جو جذباتی اور خطیبانہ عناصر سے مملو ہے، زیادہ قابل توجہ نہ سمجھیں تو بھی سمپورنانند جی کو دوبارہ غور کرنے اور اپنی رائے تبدیل کرنے پر آمادہ نہ کرسکے تب بھی ہمارے لئے ان مسلمانوں کے سامنے صحیح اسلامی نقطۂ نظر لانا ضروری ہے جو ان بیانات کو پڑھ کر صحیح رہنمائی کے طالب ہیں اور جاننا چاہتے ہیں کہ ایک سچے محب وطن شریف النفس مسلمان کا جو نسبی طور پر کسی غیر اسلامی نسل سے تعلق رکھتا ہے اپنے غیر مسلم اجداد بعید کے متعلق کیا رویہ ہونا چاہئے اور اس کی نسلی و طبعی شرافت نیز اس کے دین و ایمان کا کیا تقاضہ ہے؟

سمپورنانند جی نے درحقیقت ایک اہم علمی و ثقافتی سوال اُٹھایا ہے جو جذبات اور وقتی سیاسی اور ملکی مسائل و مصالح سے ہٹ کر سنجیدگی کے ساتھ حل اور تشفی بخش جواب چاہتا ہے، یہ مسئلہ تنہا ہندوستان کا نہیں ہے، بلکہ ان تمام ممالک کا ہے جہاں مسلمان دوسری غیر مسلم اقوام اور نسلوں میں سے نکل کر دائرۂ اسلام میں داخل ہوئے ہیں، یہ سب ممالک بھی اپنی قدیم تہذیب رکھتے ہیں اور ان کی تاریخ میں بھی عظیم شخصیتیں، حکمراں، فاتحین، اہل کمال اور عظمائے رجال گذرے ہیں، جن کے کارنامے بعد کی نسلوں کو فخر کی دعوت دیتے ہیں۔

اس سلسلہ میں پہلی بنیادی بات یہ ہے کہ اسلام ایک مثبت اور متعین عقیدہ کا نام ہے اور وہ اس کے ساتھ ایسے قلبی و روحانی تعلق کا مطالبہ کرتا ہے، جو نسل و نسب، خاک و خون اور تمام مادی رشتوں پر غالب اور مقدم ہو، کسی ماضی سے وابستگی، کسی تہذیب سے شیفتگی، اور کسی عظیم شخصیت سے عقیدت و شغف کا جہاں تک تعلق ہے اس کے لئے اسلام کی طرف سے شرط یہ ہے کہ اس دور یا شخصیت کے عقائد، اس کی دعوت اور جو کارنامے اس کی طرف منسوب ہیں وہ اس بنیادی اسلامی عقیدہ اور دعوت سے مطابقت رکھتے ہوں، جن کا اسلام علمبردار ہے،

یہاں پر ہم کو لازماً "احترام" اور "افتخار" و "انتساب" کے درمیان فرق کرنا پڑے گا، اسلام جب ہر قوم اور ہر ملک کے نامور اور عظیم افراد کے احترام کی تعلیم دیتا ہے تو جن سے نسبی تعلق ہے ان کے احترام کی تعلیم وہ کیوں نہ دے گا؟ لیکن کسی شخصیت یا کسی دور کے احترام سے قلب و دماغ، عقیدہ و فکر، اور تہذیب و معاشرت پر وہ گہرے اثرات نہیں پڑتے جو افتخار و انتساب سے پڑتے ہیں۔ ہم دنیا میں بہت سی چیزوں کا احترام کرتے ہیں، لیکن ہمارے اندر اُن کی تقلید اور پیروی کا جذبہ نہیں پیدا ہوتا، لیکن افتخار و انتساب ایک بڑی نازک اور وسیع ذمہ داری ہے، ہم انہی شخصیتوں پر فخر اور ناز کرسکتے ہیں، انہی کی طرف اپنی نسبت کرتے ہیں، اور اس میں اپنا اعزاز محسوس کرتے ہیں جن کو ہم کسی حیثیت سے معیاری و مثالی اور قابل تقلید سمجھتے ہیں، افتخار و انتساب ایک بہت بڑی نفسیاتی تبدیلی اور ذہنی سرافگندگی ہے اور اسلام کسی شخصیت کو یہ حق اس وقت تک دینے کو تیار نہیں (خواہ اس سے کیسا ہی نسل و نسب کا تعلق ہو) جب تک کہ وہ اس کے بنیادی عقیدہ سے اتفاق نہ رکھتا ہو اور ان صفات کا حامل نہ ہو جو اسلامی عظمت کا معیار ہیں۔

کوئی انصاف پسند اور تجربہ کار انسان اس سے انکار نہیں کرسکتا کہ افتخار و انتساب کا معاملہ اور کسی شخصیت کو معیاری اور واجب التقلید سمجھ لینا انسان کی فکر اور اس کی زندگی میں انقلاب برپا کردیتا ہے اور اس کے عقیدت و محبت کے مرکز کو گہرے طریقہ پر بدل دیتا ہے۔ اس لئے اسلام نے ان ہی شخصیتوں کو افتخار و انتساب و معیار کامل، و واجب التقلید ہستی کی حیثیت سے پیش کیا ہے، جن کے عقیدہ کی صحت، خدا کے ساتھ اُن کا تعلق، توحید کی طرف اُن کا دعوت دینا، اُن کی زندگی کا اعتدال و توازن اس کے نزدیک تسلیم شدہ ہے اور جن کی زندگی و تاریخ ایسی روشنی میں ہے کہ ان کے عقیدہ اور مسلک زندگی کے بارے میں کسی غلط فہمی کی گنجائش نہیں، قرآن شریف میں ان پیغمبروں کا ذکر کرنے کے بعد (جو مختلف نسلوں اور ملکوں سے تعلق رکھنے کے باوجود سب) عقیدۂ توحید کے داعی اور ہدایت کے امام تھے کہا گیا:-

"اولئک الذین ھدی اللہ فبھداھم اقتدہ۔ (یہ وہ لوگ تھے جن کو اللہ نے ہدایت دی، تم بھی ان کے طریقہ پر چلو)۔

مسلمان پانچوں وقت ہر نماز میں سورۂ فاتحہ میں یہ دعا کرتا ہے:-

"اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم۔ (ہم کو سیدھی راہ دکھا، ان لوگوں کی راہ جن پر تو نے فضل فرمایا)

مسلمان تنہا ہندوستان ہی میں نہیں ہیں، اور یہ سوال تاریخ میں پہلی بار صرف انہی کے سامنے آیا، جس ملک کے قدیم باشندوں نے اسلام قبول کیا، پہلے ہی دن عملی طور پر ان کے سامنے یہ سوال آیا، ایران میں نوشیرواں وکیخسرو، رستم و سہراب اور مانی و بہزاد کی شخصیتیں تھیں، مصر میں فراعنہ نے سیکڑوں برس تک بڑی شان و شوکت سے حکومت کی اور اپنی عظمت و قوت اور تعمیری ذہانت و عزم کے غیر فانی نقش یادگار چھوڑے، جن پر ہر مصری کو فخر کرنے کا موقع ہے۔ قدیم شام میں فینیقی، اشوری، غسانی وغیرہ نسلوں کے بڑے باعظمت فرمانروا گذرے ہیں، تاتاری نسل کے لاکھوں مسلمان چنگیز و ہلاکو کی اولاد یا ان کے خاندان سے ہیں، جنھوں نے ایک وقت میں ساری دنیا پر اپنی فتوحات کا سکہ بٹھا دیا تھا، لیکن اگرچہ رام، کرشن اور اشوک کے برخلاف یہ شخصیتیں کسی مذہب کی داعی یا اور کوئی مذہبی و روحانی شہرت و عظمت نہیں رکھتی تھیں، پھر بھی قوم پرستی کے اس دور سے پہلے جو عام طور پر یورپ کے اثرات کی پیداوار ہے کبھی مسلمانوں نے ان پر فخر اور ان سے انتساب پسند نہیں کیا، زیادہ سے زیادہ جس چیز کا ثبوت مل سکتا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے کسی خاص صنف کمال یا کسی خاص کارنامہ میں ان کے امتیاز و عظمت کا اعتراف کیا، اور یہ ایک ہی ملک کے نہیں ہر ملک کے پڑھے لکھے اور انصاف پسند انسان کا فرض ہے، اس بارہ میں کسی نسل یا وطنیت یا قومیت سے اپیل کرنے اور جذبۂ قوم پرستی کو بیدار کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ یہ ان کے ساتھ ایک طرح کی ناانصافی اور زیادتی ہے کہ ان کے کارناموں کی عظمت کے لئے نسل و قومیت سے اپیل کی جائے۔

اسلام کی قوت اور اس کی انقلاب انگیزی کا (جس میں کوئی اُس کا شریک و سہیم نہیں) یہ کرشمہ تھا کہ نومسلموں نے ہمیشہ اپنا رشتہ اسلام سے قائم کیا، وہ فخر کے ساتھ کہتے رہے کہ اسلام نے جو کچھ ان کو عطا کیا اس کے مقابلہ میں اُن کو کسی قدیم تہذیب اور اپنے اجداد پر فخر کرنے کی ضرورت نہیں، جو اسلام کے دور سے پیشتر گذرے ہیں، بلکہ صحیح اسلامی روح اور ذہنیت کا اثر یہ ہے کہ اسلام سے پیشتر کے عہد کی کمزوریوں کا فراخ دلی اور صفائی کے ساتھ اعتراف کیا جائے اور اس کا اظہار کیا جائے کہ اسلام نے ہمیں ایک نئی زندگی عطا کی۔ جیسا کہ حضرت جعفر بن ابی طالب کی اس تاریخی تقریر سے ظاہر ہوتا ہے جو انہوں نے حبشہ (ابی سینیا) کے عیسائی بادشاہ نجاشی کے بھرے دربار میں قریش کے وفد کی موجودگی میں کی، حالانکہ وہ عرب کی سب سے معزز شاخ قریش اور بنی ہاشم سے تعلق رکھتے تھے، دوسرے غیر عرب نومسلموں نے بھی بارہا اپنی تاریخ اور شعوری زندگی کا آغاز اسلام سے کیا ہے۔

ایک ایرانی نومسلم سلمان فارسی رضؓ سے اُن کا نسب دریافت کیا گیا تو انہوں نے بے تکلف کہا "سلمان ابن الاسلام" (سلمان فرزند اسلام) حالانکہ وہ اسی کیخسرو، نوشیرواں اور رستم و سہراب والی نسل سے تعلق رکھتے تھے،

خود ہندوستان میں متعدد ذی علم لوگوں نے اس تاریخ کا اعادہ کیا، راسخ العقیدہ ایرانی فضلاء نے ہمیشہ سعد بن ابی وقاصؓ (فاتح ایران) خالد بن الولیدؓ (فاتح شام) اور دوسرے عرب بہادروں کے کارناموں کا عظمت سے ذکر کیا، ایران کو قدیم زمانہ سے حضرت علی مرتضیٰؓ اور ان کے صاحبزادوں حضرت حسنؓ و حضرت حسینؓ کی ذات سے (جو نسلاً خالص عرب تھے) جو والہانہ عقیدت و شیفتگی رہی ہے اور ہے وہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ اسلامی جذبہ اور اس کی بین الاقوامیت ایرانی قوم پرستی پر ہمیشہ غالب رہی اور اب بھی غالب ہے خود عربوں نے جب اسلام قبول کیا تو ان کی تاریخ عظماء و ابطال (ہیروز) کے ناموں اور کارناموں سے بھری ہوئی تھی، لیکن انہوں نے اپنے کسی دور میں بھی اُن کے ساتھ افتخار و انتساب کا معاملہ نہیں کیا اور عرب قوم پرستی کے اس دور میں بھی اُن کو اپنا لیڈر اور قومی ہیرو نہیں بنایا گیا۔ اس موقع پر حاتم طائی اور ابن جدعان کا (جو زمانۂ جاہلیت میں فیاضی و مہمان نوازی کے لئے ضرب المثل تھے) نام لیا جاسکتا ہے، لیکن عرب کی تاریخ و ادب سے جس چیز کا ثبوت ملتا ہے وہ صرف ان کا احترام اور ان کے کارناموں کا اعتراف ہے اور وہ بھی صرف ایک ہی صنف کمال میں، یعنی فیاضی و مہمان نوازی میں جس میں ان کو شہرت و امتیاز حاصل تھا۔

سمپورنانند جی کے اس ارشاد میں کئی علمی غلطیاں اور کمزوریاں ہیں جو ان جیسے صاحب علم و فکر انسان سے بعید ہیں، ایک تو یہ کہ انہوں نے اپنے اس مشورہ اور ہندستان کی عظیم شخصیتوں کے ناموں کے انتخاب میں نسل و مذہب کو مخلوط کردیا ہے۔

اگر ان کو مسلمانوں کو صرف نسلی بنیاد پر اپنے اجداد کی نسبت اور ان پر فخر کرنے کا مشورہ دینا تھا تو ان کو ایسی شخصیتوں کا انتخاب کرنا چاہئے تھا جن کے ساتھ کوئی مذہبی دعوت یا روایت وابستہ نہ ہو،

اس لئے کہ مسلمان ایک خاص عقیدہ اور دعوت رکھنے والی مذہبی ملت ہیں

ان کے لئے کسی ایسی شخصیت پر فخر کرنے اور اس سے اپنا انتساب کرنے کی مذہبی طور پر گنجائش نہیں جو کسی دوسرے عقیدہ اور مذہب اور فلسفۂ زندگی کی داعی یا اس کی خدمت میں اپنا نام پیدا کرچکی ہو۔ ایران میں (جس کی سمپورنانند جی نے مثال دی ہے) دو قسم کی شخصیتیں پائی جاتی ہیں، ایک وہ جو کسی مذہب یا عقیدہ کے داعی یا پیشوا تھے، اور دوسرے وہ جن کی کوئی خاص مذہبی شہرت و شخصیت نہیں، البتہ ان کو انسانی کمالات میں سے کسی کمال میں خاص امتیاز حاصل تھا، **ایرانی النسل مسلمانوں نے ان شخصیتوں پر کبھی فخر نہیں کیا اور نہ ان کی طرف انتساب پسند کیا جو کسی مذہب یا فلسفہ کے بانی یا داعی تھے، مثلاً زردشت اور مزدک، ایرانی مسلمان مفکرین اور نقاد ان کے خیالات اور فلسفوں کی تردید کرتے رہے ہیں اور انہوں نے کبھی ان کا نام عقیدت مندانہ طور پر نہیں لیا،** اس کے برخلاف ایرانیوں نے مانی و بہزاد اور رستم و سہراب کے کارناموں کے اعتراف اور ان کے احترام میں کبھی بخل سے کام نہیں لیا لیکن اس میں بھی یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ ان شخصیتوں کا اعتراف و احترام بھی ان کے اسی صنف کمال کے دائرہ میں محدود ہے جس میں وہ عالم گیر شہرت کے مالک ہیں یعنی مانی و بہزاد نقاش و مصور کی حیثیت سے، اور رستم و سہراب، قوت و شجاعت کے لحاظ سے خاص احترام و عزت کے مستحق سمجھے گئے، لیکن اس کے برخلاف رام و کرشن بلند مذہبی شخصیت رکھتے ہیں اور ایک خاص مذہب و فلسفہ کے بانی یا ان کے عظیم ترین داعیوں میں ہیں اور ایک خاص مذہبی پیشوا نہیں تھا لیکن وہ بدھ مذہب کا پرجوش مبلغ تھا۔ اور ہندستان سے باہر اس مذہب کی اشاعت کا سہرا اسی کے سر ہے، اسی کی بدولت بدھ مذہب صدیوں تک کے دور دراز ملکوں پر حکومت کی۔ ایک نفسیاتی نکتہ اور بھی ہے جس کو سمپورنانند جی نے نظر انداز کردیا، لیکن ہم مسلمان اس کو نظر انداز نہیں کرسکتے وہ یہ کہ ہندستان میں ایک عرصہ سے قدیم برہمنی تہذیب کے احیاء اور تجدید کی باتیں جاری ہیں اور نہ مسلمانوں کو بھی اس قدیم ہندستانی تہذیب اور فلسفۂ حیات کی طرف بازگشت کی دعوت دی جارہی ہے، ایسے ماحول میں مسلمانوں کا ان قدیم تر اجداد پر فخر و مباہات اور انکی طرف انتساب کی دعوت قبول کرلینا (جو اس تہذیب و فلسفہ کا نشان ہیں) مسلمانوں کی موجودہ نسل کے ملی وجود، اسلامی خصائص اور دینی مستقبل کے لئے ایک بڑے خطرہ کی بات ہے۔ اور ان سب لوگوں کو جن کو اس نسل کا اسلامی عقیدہ اور اسلامی تہذیب عزیز ہے، اس دعوت کے مقاصد اور اس کے علمبرداروں کے خلوص میں شبہ کرنے کی پوری گنجائش ہے۔ ہندستان کی ان قدیم شخصیتوں کو جن کی پشت پر ایک تہذیب کی دعوت ہے اور جس کے احیاء کی بھرپور جد و جہد بھی آج ہو رہی ہے، ان شخصیتوں پر قیاس کرنا کسی طرح صحیح نہیں، جو محض تاریخ و ادب اور افسانہ کی زینت ہیں جو لوگ ایران کے رستم و سہراب کی یا یونان کے افلاطون و ارسطو کی مثال دے کر ہندستان کی آرین نسل کے قدیم اجداد کو اپنا بزرگ و پیشوا تسلیم کرنے اور ان کی طرف فخر سے اپنا انتساب کرنے کی دعوت دے رہے ہیں، یا تو خود مغالطہ میں ہیں یا دوسروں کو مغالطہ دینے کی کوشش کررہے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک اور بات بھی قابل غور ہے، وہ یہ کہ سمپورنانند جی نے معلوم نہیں کیوں فرض کرلیا ہے کہ ہندستان کے نوے فیصدی مسلمان (جو بقول ان کے ہندستانی نسل سے تعلق رکھتے ہیں) سب آرین نسل کے اجداد اور ناموروں کی اولاد اور جانشین ہیں، تاریخ کا ایک معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ ہندی الاصل مسلمانوں کی زیادہ بڑی تعداد ہندستان کی ان قدیم اقوام سے نسلی تعلق رکھتی ہے جو آریوں کے ورود ہندوستان سے پہلے اس ملک کے اصلی باشندہ اور یہاں کے حکمراں تھے پھر اگر مسلمانوں کو اپنی سعادتمندی اور نسبی وفاداری ہی کا ثبوت دینا ہے تو ان قدیم اجداد کے نام کیوں نہیں لئے جاتے جو ان نومسلم مسلمانوں کے اور جنوبی ہند و وسط ہند کی قدیم اقوام کے مورث اعلیٰ ہیں، درحقیقت ہندستان کی تہذیب اور اقوام کو اس آرین نسل اور اس کے چند گنے چنے با اثر افراد کے ساتھ (جو ایک مخصوص دور و تہذیب کے نمائندہ تھے اور جن سے ہندستان کے قدیم باشندوں کو سخت شکایات بھی ہیں) محدود کرلینا، تاریخ کے ساتھ سخت ناانصافی اور بڑی کوتاہ نظری ہے۔

دسؔ دن —— پانچ دریاؤں کی سرزمین میں

اسحٰق جلیس ندوی

★

خاک و خون میں غلطاں ۱۹۴۷ء کے پنجاب کے المناک واقعات بچپن سے کان میں پڑے تھے، شعور کی سرحد میں قدم رکھا تو تقسیم ہند اور آزادیٔ وطن کے دور کے ہولناک واقعات کو رامانند ساگر کی کتاب "اور انسان مرگیا" کرشن چندر کی "ہم وحشی ہیں" ایم اسلم کی "رقص ابلیس" عادل رشید کی "درندے" اور نہ جانے کتنی کتابوں، آپ بیتیوں اور مضامین میں پڑھا تھا، انسانی خون کی ارزانی، انسانی آبرو کی پامالی اور اس ظلم اور سفاکی پر یقین کرنا مشکل تھا کہ کیا انسان ایسی پستی پر بھی اتر سکتا ہے —؟ کیا انسانیت کے سرے انسانوں کے ہاتھوں ایسی قیامت گذر سکتی ہے؟

ع
پستی کا کوئی حد سے گذرنا دیکھے

پانچ دریاؤں کی سرزمین پنجاب میں ۴۷ء کے جنونی دور میں انسانی خون کا ایک چھٹا دھارا بہہ پڑا تھا، اور یہ بات وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی تھی کہ کبھی اس دھرتی پر امن و اخلاق، انسانیت اور محبت کی دعوت لے کر چند خدا کے بندے گذرینگے تو ان کی ایسی پذیرائی ہوگی اور ایسا استقبال ہوگا کہ جس سے اس سرزمین کی اصل روایات زندہ ہو جائیں گی، اس سفر سے اندازہ ہوا کہ یہاں کے باشندوں کے خمیر میں درد و محبت ہے، جس کی آبیاری حضرت مجدد الف ثانیؒ سے لیکر حضرت شاہ عبدالرحیم صاحبؒ، حضرت شاہ عبدالقادر صاحب رائپوریؒ تک کتنے ہی علماء اور صوفیا نے اور غیر مسلموں میں وحدت کے گیت گانے والے بابا گرونانک جیسے لوگوں نے کی تھی،

۴۷ء کی جنونی لہر سے گذرنے کے بعد اس کا گمان بھی نہ تھا کہ یہ علاقہ اخوت و محبت کے پیام سے ایسا مسحور و متاثر ہوگا جیسے کسی ساز کو مدت سے کسی مضراب کا انتظار ہو اور اس کے رسیلے نغمے پھوٹ پڑیں۔

تحریک پیام انسانیت کی دعوت کا اولین مستحق یہی علاقہ تھا، جہاں صرف تیس سال پہلے ظلم و بربریت کی وہ تاریخ مرتب ہوئی تھی جس کی نظیر تاریخ عالم میں شاید بمشکل ملے، لیکن ہم بڑی تاخیر سے پہونچے، ع

ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا

پنجاب (جو تین ریاستوں، ہریانہ، ہماچل پردیش کے نام سے منقسم ہو چکا ہے) کا یہ علاقہ ہمارے لئے ایک غارِ سرنگ کی مانند تھا، وہ سرا سمجھ میں نہیں آتا تھا، جسے ذریعہ بنا کر ہم اس علاقہ کو قریب سے دیکھتے، متعین طور پر یہی معلوم کرنا مشکل تھا کہ مسلمانوں سے اجڑے اس دیار میں وہ کون سے مقامات ہیں، جہاں کچھ سخت جان اہل ایمان اب بھی آباد ہیں۔ یہ مرحلہ اس طرح طے ہوا کہ ندوہ کے ایک طالب علم مولوی ظریف احمد کو جو ضلع انبالہ کے رہنے والے ہیں، اس پورے علاقہ کے دورہ پر اس ہدایت کے ساتھ روانہ کیا گیا کہ وہ اس علاقہ کا مشاہدہ کرکے جلسوں کے مقامات کا تعین اور پروگرام کی تفصیل مقامی حضرات سے مشورہ اور گفتگو کے بعد طے کریں۔ انہوں نے ایک ہفتہ تک اس علاقہ کا دورہ کرکے مقامی حضرات کے مشورہ سے پروگرام مرتب کیا،

بنام خدا ۱۲ مارچ ۷۶ء کی شام کو لکھنؤ سے ضلع انبالہ کے شہر جگادھری (جمنانگر) روانگی ہوئی، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا معین اللہ ندوی، ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، جناب عبدالکریم صاحب پاریکھ، مولوی مصطفیٰ رفاعی ندوی بنگلوری، وکیل احمد صاحب جونپوری، حاجی عبدالرزاق صاحب اور راقم سطور پر مشتمل یہ قافلہ صبح صادق سے قبل جگادھری جنکشن پہونچا، پلیٹ فارم پر مولانا مفتی عبدالعزیز صاحب (مدرس مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور) نیز مدرسۂ اسلامیہ ناہر پور کے مہتمم صاحب اساتذہ اور طلبہ نے خیر مقدم کیا، جمنا نگر اسٹیشن سے چند میل کے فاصلہ پر واقع ایک بستی ناہر پور کے مدرسۂ اسلامیہ میں قیام رہا، مدرسہ کے اساتذہ، طلبہ اور منتظمین نے مہمانوں کی خاطر مدارات میں بڑی مستعدی اور خلوص کا ثبوت دیا،

ناشتہ کے بعد ۸ بجے مقامی میونسپل بورڈ کے دالان پر جلسہ ہوا، صدارت ایک مقامی معزز غیر مسلم صاحب نے کی، جلسہ سے مولانا مدظلہ اور عبدالکریم پاریکھ صاحب نے خطاب کیا، غیر مسلم بھائیوں کی معتد بہ تعداد شریک جلسہ تھی، اس علاقہ میں یہ اپنی نوعیت کا منفرد جلسہ تھا، سامعین کا اچھا تاثر رہا، ہمارے قافلے کے لئے یہ مبارک اور حوصلہ افزا آغاز تھا۔

اس جلسے کے فوراً بعد ضلع انبالہ کے ایک قصبہ بوڑیا جانا تھا، جہاں دن میں دس بجے جلسے کا اعلان تھا، دو کاریں مہمانوں کے لئے آگئی تھیں۔ پاریکھ صاحب، ڈاکٹر اشتیاق صاحب، اور راقم سطور پہلے روانہ ہوئے، تاکہ وقت پر جلسہ کرا سکیں۔ حضرت مولانا کو راستے میں ایک مدرسہ کے معائنہ کی دعوت دی گئی تھی، موصوف وہاں سے فارغ ہوکر بوڑیا پہونچے۔

بوڑیا ۱۹۴۷ء سے قبل ایک ریاست تھی، ایک انسان دوست، انصاف پسند سکھ راجہ صاحب یہاں کے حکمراں تھے، جو آج بھی اپنی انسانی اور اخلاقی صفات و خصوصیات کی بناء پر، اس قصبہ کی ایک محبوب شخصیت ہیں۔

۴۷ء کے دورِ وحشت و بربریت میں ان انسان دوست راجہ کی شب و روز محنت اور دوڑ دھوپ کے نتیجہ میں یہاں کے مسلمان محفوظ رہے اور ان کو کسی قسم کے جانی یا مالی نقصان سے دوچار نہ ہونا پڑا، پیام انسانیت کے جلسے کی صدارت کے لئے مقامی منتظمین نے راجہ صاحب کا نام طے کیا تھا اور یہ بہت صحیح انتخاب تھا۔

بوڑیہ میں حضرت رائے پوریؒ سے تعلق رکھنے والے ایک بزرگ حاجی عبدالکریم صاحب نے ایک دینی مدرسہ قائم کیا ہے، حاجی صاحب اپنی نیک نفسی، سادگی، اخلاص و محبت اور دینداری کی وجہ سے اس علاقہ کے مسلم اور غیر مسلم عوام و خواص میں بہت مقبول اور معروف ہیں، خود راجہ صاحب انکی بڑی عزت کرتے ہیں اور ان کی دعا اور توجہ کی تاثیر کے قائل ہیں۔

ہماری کار بستی کی سرحد میں داخل ہوئی اور مدرسہ کے طلبہ، اساتذہ اور قصبہ کے معززین نے بڑی گرمجوشی سے خیر مقدم کیا، مدرسہ میں کچھ دیر قیام کے دوران راجہ صاحب، اور سردار سریندر سنگھ صاحب (جن کا شمار یہاں کے بڑے زمینداروں میں ہوتا ہے، یہ مشہور ایگریکلچرسٹ، مالوا شوگر مل اور بنک آف کامرس دہلی کے ڈائرکٹر ہیں) اپنے ایک اور سردار رفیق کیساتھ مدرسہ کے اس چھوٹے سے حجرے میں تشریف لے آئے، باہمی تعارف کے بعد ان حضرات سے بڑی محبت اور اپنائیت کی فضا میں گفتگو رہی، تحریک پیام انسانیت کے اغراض و مقاصد سے راجہ صاحب اور ان کے رفقاء بہت متاثر ہوئے۔

جلسہ کا وقت ہو چکا تھا، جلسہ گاہ پہنچے، ایک کھلے میدان میں وسیع پنڈال اور خوبصورت ڈائس، اس چھوٹے سے قصبہ کے لوگوں کے حسن انتظام کی گواہی دے رہا تھا، اسٹیج پر کئی سکھ اور ہندو سربرآوردہ حضرات تشریف فرما تھے، ان میں فخری جین صاحب، لکھنؤ یونیورسٹی کے گریجویٹ، بستی کی معزز اور مخیر شخصیت، علم دوست اور اردو نواز انسان سے جب تعارف ہوا تو ان کی گفتگو سے ایسا محسوس ہوا کہ ہم ہریانہ کے کسی قصبہ میں نہیں ہیں بلکہ لکھنؤ کے کسی ادبی مجلس میں ہیں۔ فصیح اردو میں گفتگو اور لکھنوی تہذیب و شائستگی کا نمونہ۔

راقم سطور کی افتتاحی تقریر ہوئی، اس کے بعد ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اور عبدالکریم صاحب پاریکھ نے خطاب فرمایا۔ اب مولانا تقریر فرمانے والے تھے، مولانا کی تقریر سے پہلے مولوی وصف الرحمٰن صاحب واصف نظامی طاہر پوری نے ایک مرصع خیر مقدمی نظم پڑھی،

مولانا نے فرمایا:-

"میں انسان کے سوا اس دنیا میں کسی کو معزز نہیں سمجھتا، سر سبز درخت، خوبصورت پھول، بڑے سے بڑا قلعہ، عمدہ سے عمدہ عمارت، چاہے وہ آگرہ کا تاج محل ہو یا ایلورا اجنتا کے غار ہوں، سنگ تراشی کے نمونے ہوں یا اٹلی کے مجسمے، سمندر، اسکی گہرائی اور وسعت، ستارے، چاند اور سورج کی چمک اور روشنی یہ سب انسان کے سامنے ماند ہیں، آخری بات یہ کہ یہ سب انسان کی خدمت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں۔ خدا کے بعد اگر کوئی بڑا ہے اور اس کی تخلیق کا اعلیٰ شاہکار ہے تو وہ انسان ہے۔ — انسان کا ایک سرا، ایک رشتہ اس کائنات کے مالک سے ملا ہوا ہے اپنے مالک اور خالق سے وہ حکم اور ہدایات لے اور دنیا میں اسے چلائے، انسان اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے۔ وہاں سے اس کی مدد ہو اور یہاں وہ بادشاہی کرے۔ اللہ سے لے اور بندوں میں تقسیم کرے۔ اسی کو خدا کے آخری پیغمبر نے فرمایا تھا، "انما انا قاسم واللہ یعطی" میں بانٹنے والا ہوں اور اللہ دینے والا ہے۔

یہاں ہاتھ نہیں رکتا، وہاں ہاتھ نہیں تھکتا۔ ایک طرف تو انسان کی شان یہ ہے کہ اس کا ایک سرا تو خالق کائنات کے عرش سے بندھا ہوا ہے، اور دوسری طرف اپنے ابنائے جنس میں اور اسی دنیا میں اس کو محدود وقت گذارنا ہے، اگر

(بقیہ صفحہ پر)

اس موقع پر اس تلخ حقیقت کا اظہار بھی ضروری ہے کہ ہندستان کے مختلف فرقوں اور عناصر میں جذباتی ہم آہنگی" پیدا کرنے کے لئے اقلیتوں میں کام کرنے سے کہیں زیادہ اکثریت میں محنت کرنے کی ضرورت ہے، جس کو خدا نے دیکھنے والی دو آنکھیں عطا فرمائی ہیں، وہ صاف طریقہ پر دیکھ رہا ہے کہ "جذباتی ہم آہنگی" کا فقدان یا اس میں کمی ہے تو اس میں اکثریت کے طرز عمل، اس کے بے لوچ سماجی اصولوں، اور اس کے نفرت و استکبار کو بہت بڑا دخل ہے۔

جبل پور اور علی گڑھ کے واقعات نے روز روشن کی طرح یہ بات ثابت کردی کہ اکثریت کی ذہنیت میں کس قدر تبدیلی و انقلاب کی ضرورت ہے اور اس کے لئے کتنی سخت محنت اور جرأت کی ضرورت ہے، یہ بڑی بدقسمتی کی بات ہے کہ جو لوگ ملک کی اصلاح کے لئے کھڑے ہوتے ہیں وہ اکثریت کی اصلاح و تربیت کے پُر مشقت اور محنت طلب کام کو چھوڑ کر اقلیت کو وعظ و نصیحت اور اس کو اخلاقی و علمی درس دینے کے آسان کام کو اختیار کر لیتے ہیں، قوموں کی جدید ذہنی تعمیر و تشکیل اور مختلف عناصر میں دیانتدارانہ و مساویانہ طریقہ پر ہم آہنگی پیدا کرنے کے لئے فرہاد کا جگر اور قیس کا جنون چاہیئے۔ سہولت پسندی محض خطابت اور یک طرفہ مشورہ دینے سے صورت حال میں کوئی تبدیلی نہیں پیدا ہو سکتی۔

حیرت کی بات ہے کہ اکثریت کا بے لاگ اخلاقی محاسبہ کرنے اور تمام مصلحتوں اور خطروں سے بے نیاز ہوکر اس کے منہ پر کلمۂ حق کہنے والے افراد بہت کم نظر آتے ہیں اور یہ کسی ملک کا سب سے بڑا خلا اور خطرہ کی نشانی ہے۔

آخر میں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ جذباتی ہم آہنگی"، کے لئے اس طرح کی تحریک نہ صرف غیر ضروری بلکہ مُضر ہے۔ اگر سمپورنانند جی اس ہم آہنگی کے لئے یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کو ایسی دعوت دی جائے جو ان کے جذبات و عقائد اور بنیادی دینی اصول کے خلاف ہے تو یہ تحریک مسلمانوں کو بجائے قریب کرنے کے اور دور کرے گی، اگر وہ دیانتداری سے اس پر عقیدہ رکھتے ہیں تو ان کا انتخاب ایسی کمیٹی کی صدارت کے لئے (جس کا کام "جذباتی ہم آہنگی" پیدا کرنا ہے نہ کہ شکوک و شبہات اور تلخی و شکایات کی تخم ریزی) سخت ناموزوں ہے، مسلمانوں کو موجودہ ہندستان کی خدمت اور تعمیر و ترقی کا فرض انجام دینا ہے اور اس کے لئے دوسرے محب وطن دوستوں کے ساتھ مل کر "جذباتی ہم آہنگی" کے ساتھ اس ملک کا پایہ بلند کرنا اور نام روشن کرنا ہے اس کے لئے کسی قدیم دور، یا کسی قدیم نسل پر فخر اور اس کی طرف انتساب کی عملاً کوئی ضرورت نہیں، جدید ہندستان خود ایک حقیقت ہے جس کو نہا ہمیں مدنظر رکھنا چاہیئے۔ جذباتی ہم آہنگی کا تقاضہ اسی جدید ہندستان کی پیداوار ہے اور یہی اس کے لئے مضبوط اور معقول بنیادیں بھی فراہم کرے گا،

ان بنیادوں کی تلاش میں ماضی بعید کی طرف جانا نہ صرف عبث بلکہ سخت ضرر رساں ہے —!!

بقیہ صفحہ: دسؔ دن۔ پانچ دریاؤں کی سرزمین میں

اگر بلندی پر جائے تو فرشتوں کو پیچھے چھوڑ جائے، اور اگر پستی پر اتر آئے تو جانوروں کو شرما دے، سانپوں، بچھوؤں اور درندوں کو ہزار بار توبہ دلوا دے۔"

مولانا نے اس تمہید کے بعد انسانیت و اخلاق محبت اور بھائی چارگی کا موثر پیرائے میں ذکر کیا، دوران تقریر بعض متاثر کن واقعات نے سامعین کو آبدیدہ کر دیا، صدر جلسہ راجہ صاحب پر بھی اثر و تاثر کی یہ حالت پوری تقریر میں طاری رہی، مولانا کے بعد انہوں نے اپنے صدارتی کلمات میں اپنے اس تاثر و کیفیت کا ذکر کیا اور دور دراز غیر معروف مقامات تک اس عمر اور صحت کی کمزوری کے باوجود زحمت سفر گوارا کرنے اور محبت و انسانیت کے پیام کو پہونچانے پر مولانا کا خاص طور پر انہوں نے شکریہ ادا کیا۔

دوپہر کے بعد اس قصبہ میں بڑا مشغول پروگرام رہا، راجہ صاحب نے اپنے محل میں، جین صاحب نے اپنی کوٹھی پر اور سریندر سنگھ صاحب نے اپنے بنگلہ اور فارم پر چائے کی دعوت دی،

تینوں مقامات پر حاضری ہوئی، مغرب کی نماز سریندر سنگھ صاحب کے بنگلہ پر ادا کی گئی اور رات ہی کو جمنا نگر ہوتے ہوئے ہم لوگ چپلی مزرعہ پہونچے۔ (جاری)

غزل

پروفیسر رشید کوثر فاروقی

دنیا میں کوئی خوش ہے بھلا، کوئی نہیں ہے
اس پر بھی تو جینے سے خفا کوئی نہیں ہے

تم کہتے ہو بے نغمہ سرا کوئی نہیں ہے
ہم کہتے ہیں گوش شنوا کوئی نہیں ہے

یہ عشق ہے، ہر چوٹ کو سہنے کے علاوہ
اس درد مسلسل کی دوا کوئی نہیں ہے

جب راہ نما تھے تو کبھی بات نہ پوچھی
روتے ہو کہ اب راہ نما کوئی نہیں ہے

ہر ملک ہے ویران، ہر اک تخت ہے خالی
کس سر پہ اُتر جائے ہُما، کوئی نہیں ہے

فرسودہ روایات کو توڑو تو چلے کام
گر ہیں تو ہزاروں ہیں، سرا کوئی نہیں ہے

کھنچتی ہیں کیا جانیے کس شئے سے شرابیں
عادت ہے سو پیتے ہیں، مزا کوئی نہیں ہے

ظالم سے مظالم کا سبب پوچھ رہے ہو
ہاں یہ بھی خطا ہے کہ خطا کوئی نہیں ہے

فریاد کو بھی حوصلہ درکار ہے یارو
ہونٹوں میں جنبش ہے، صدا کوئی نہیں ہے

یہ دَور ہے بندوں کی خدائی کا مرے دوست
اس دور میں بندوں کا خدا کوئی نہیں ہے

قانون پہ دنیا کے ہنسی آتی ہے کوثر
نادیدہ جرائم کی سزا کوئی نہیں ہے

اس دائرہ میں اگر سُرخ نشان ہے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ کا چندہ ختم ہو چکا ہے، آپ آئندہ سال کے لئے Rs. 12/- ارسال فرمائیے، اگر اگلے شمارہ کی روانگی سے قبل آپ کا چندہ وصول نہ ہوا تو اگلا شمارہ 15/2 کے مطالبہ میں وی۔ پی سے روانہ ہوگا جسے وصول کرنا آپ کا اخلاقی فرض ہوگا۔

منی آرڈر کوپن پر اپنا پورا پتہ اور خریداری نمبر ضرور لکھیں۔

(منیجر)

تاریخ کے دریچے سے

ایفائے وعدہ: دہلی کا شمس الدین التمش (۶۰۷-۶۳۳ھ / ۱۲۱۰-۱۲۳۵ء) ترکستان کے قبیلہ البری کے ایک بڑے گھرانے کا فرزند تھا، اس کا باپ ایلم خان اپنے قبیلہ کا سردار تھا، اپنی دولت، ثروت، خدم اور حشم کی وجہ سے بہت شہرت رکھتا تھا، اس کے کئی لڑکے تھے، لیکن وہ التمش کو اسکے حسن و جمال کی وجہ سے بہت عزیز رکھتا تھا، ایلم خاں کی یہ محبت اس کے دوسرے بیٹوں کو اچھی نہ معلوم ہوئی، اور انہوں نے التمش کے ساتھ وہی سلوک کیا جو حضرت یوسفؑ کے بھائیوں نے آپ کے ساتھ کیا تھا۔ التمش کے بھائیوں اور بھتیجوں نے اس یوسفِ ترکستان کو گلہ بانی اور شکار کے بہانے دور دراز باغ و صحرا میں لیجا کر ایک سوداگر کے ہاتھ فروخت کر ڈالا، سوداگر اس کو بخارا لے گیا، جہاں اس شہر کے صدر جہاں کے ایک عزیز نے اس کو خرید لیا، یہ خاندان اپنی بزرگی اور مذہبی فضیلت کے لحاظ سے ممتاز تھا، یہاں التمش اپنے آقا کے لڑکوں ہی کی طرح پرورش پاتا رہا، اس نے بھی اپنے آقا کی خدمت گذاری میں غیر معمولی اخلاق و دیانت کا ثبوت دیا، ایک روز صدر جہاں کے خاندان کے کسی فرد نے التمش کو ایک قراضہ بازار سے انگور لانے کو دیا، راستہ میں یہ قراضہ گم ہوگیا، وہ بیٹھ کر رونے لگا، رو رہا تھا کہ ایک درویش اس کے پاس پہونچا، اس نے اس پر شفقت کی اور اس کو انگور خرید کر دے دیا اور اس سے یہ وعدہ کرایا کہ جب اس کو دولت اور ملک حاصل ہو تو وہ درویشوں کی تعظیم اور ان کے حقوق کی نگہداشت کرے گا، جب وہ دہلی کا بادشاہ ہوا تو وہ برابر بزرگان دین کی خدمت کر کے اپنے وعدہ کو پورا کرتا رہا۔

تالیف قلوب: جب التمش دہلی کا بادشاہ ہوا تو وہ اپنی بادشاہت کے زمانہ میں تمام بزرگان دین خصوصاً خواجگان چشت کا بہت معتقد اور گرویدہ رہا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکیؒ (المتوفی ۶۳۳ھ / ۱۲۳۵ء) کے ہاتھ پر بیعت بھی کی۔ ان سے عرفان و طریقت کی علمی و عملی تعلیم آخر وقت تک حاصل کرتا رہا، ایک بار حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ اجمیر سے دہلی آئے، تو ان کے دیدار سے مشرف ہونے کے لئے دہلی کے تمام خواص و عوام ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، لیکن ان کے پیر بھائی نجم الدین صغریؒ ان سے ملنے نہ آئے، جن کو سلطان التمش نے شیخ الاسلام کے عہدہ پر مامور کر رکھا تھا، حضرت خواجہ معین الدینؒ خود ان سے ملنے گئے، اس کے باوجود شیخ نجم الدین صغریؒ ان سے گرم جوشی کے بجائے سرد مہری سے ملے، حضرت خواجہ معین الدینؒ نے یہ محسوس کر کے ان سے وجہ پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ جب سے ان کے حکم سے حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ دہلی میں مقیم ہوئے، شیخ الاسلام کی عزت و وقعت باقی نہیں رہی ہے، تمام لوگ قطب صاحب ہی کی طرف مائل رہتے ہیں، کوئی ان کے یعنی نجم الدین صغری کے پاس نہیں آتا، حضرت خواجہ معین الدینؒ نے ان کے بار خاطر کے دور کرنے کا یقین دلایا، اور قطب صاحب کے پاس آکر ان کو دہلی چھوڑ دینے اور اپنے ساتھ اجمیر چلنے کا حکم دیا، یہ حکم سُن کر دہلی کے تمام باشندے ششدر رہ گئے۔

خود سلطان التمش دم بخود تھا کہ اس کے شیخ الاسلام نے اس کے مرشد کے ساتھ زیادتی کی، لیکن اپنے شیخ الاسلام سے باز پرس کرنے کے بجائے اس نے حضرت خواجہ معین الدینؒ سے اس حکم کے بدلوانے کے لئے منت کی، لیکن حضرت خواجہ نے اس کی بات نہ مانی، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ درویشی کی شان یہ ہے کہ درویش سے کسی ایک کی بھی دل آزاری نہ ہو، جب دونوں بزرگان دین دہلی سے رخصت ہونے لگے، تو لوگوں کو ایسا معلوم ہوا کہ شہر دہلی معرفت کے آفتاب و ماہتاب کی تجلیوں سے محروم ہو رہا ہے، ہر طرف کہرام مچ گیا، تمام اہل شہر ان دونوں بزرگوں کے پیچھے پیچھے چلے، ان ہی کے جلو میں سلطان التمش بھی تھا، قطب صاحبؒ کی ذات سے لوگوں کی شیفتگی و فریفتگی کا یہ حال تھا کہ جس جگہ وہ قدم مبارک رکھتے تھے لوگ اس جگہ کی خاک کو تبرکاً اٹھا لیتے تھے، اور اس طرح آہ و بکا کرتے تھے، جس طرح فراقِ یار پر عاشق زار کرتے ہیں، حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ نے یہ منظر دیکھا تو ارشاد فرمایا کہ بختیار تم یہیں رہو، میں تم کو اس لئے لے جا رہا تھا کہ دہلی میں تمہارے رہنے سے ایک شخص کی دلآزاری ہوتی ہے، لیکن دہلی میں تمہارے نہ رہنے سے دہلی کے تمام لوگوں کے دل خراب و کباب ہوں گے، جو گوارا نہیں کیا جا سکتا، اس فیصلہ سے دہلی کے لوگ پھولے نہ سمائے، خود سلطان التمش نے خوشی میں بڑھ کر حضرت خواجہ معین الدینؒ کے قدم چومے اور قطب صاحب کے ساتھ خوش خوش دہلی آیا۔

خوفِ قیامت: حضرت قطب الدین بختیار کاکیؒ سلطان التمش کو بہت عزیز رکھتے تھے، وہ اپنے ملفوظات فوائد السالکین میں فرماتے ہیں کہ التمش کا عقیدہ صحیح تھا، وہ راتوں کو جاگتا، کسی نے اس کو سوتے نہیں دیکھا، اگر سو جاتا تو فوراً بیدار ہو جاتا، اٹھ کر وضو کرتا، اپنے نوکروں میں سے کسی کو نہ جگاتا، اور کہتا کہ آرام سے سونے والوں کو کیوں تکلیف دی جائے، رات کو وہ گدڑی پہن لیتا اور کسی کو ساتھ لے کر باہر نکل جاتا، اس کے ہاتھ میں سونے کے تنکے کا ایک توشہ دان ہوتا، لوگوں کے دروازے پر جاتا، ان کے حالات پوچھتا، ان کی مدد کرتا، ان کو قسمیں دے کر تلقین کرتا کہ جب ان کے پاس کھانے پینے کو کچھ نہ رہے یا کوئی ان پر ظلم کرے تو وہ اس کے دربار کے پاس آکر عدل و انصاف کی لٹکی ہوئی زنجیر کو ہلائیں تاکہ وہ ان کے ساتھ انصاف کر سکے، ورنہ قیامت کے روز ان کی فریاد کا بار اس کی طاقت برداشت نہ کر سکے گی۔

حضرت قطب صاحب فوائد السالکین میں یہ بھی فرماتے ہیں کہ ایک رات التمش میرے پاس آیا اور میرا دامن پکڑ لیا، میں نے کہا کہ مجھ کو کب تک تکلیف پہونچاتے رہو گے، جو ضرورت ہو بیان کرو، اس نے کہا کہ اپنی عنایت سے آپ نے رب العزت سے مجھ کو مملکت تو دلا دی ہے، لیکن قیامت کے روز جب مجھ سے اس کی باز پرس ہوگی اور اس کا حساب دینا ہوگا تو اسوقت آپ مجھے نہ چھوڑیں، وہ اس وقت واپس گیا جب میں نے اس کو ہر طرح تسلی دلائی۔

ذریعہ بخشش: سلطان التمش نے دہلی میں پینے کا پانی فراہم کرنے کے لئے ایک بڑا حوض بنوایا تھا، جو حوض شمسی کے نام سے مشہور ہوا، جب اس کے بنوانے کا ارادہ کیا تو ارکان سلطنت کے ساتھ زمین تلاش کرنے کو نکلا، اس کو ایک جگہ پسند آگئی، جب محل واپس آیا تو رات کو نماز پڑھ کر مصلیٰ پر سو گیا، خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی جگہ گھوڑے پر سوار ہیں جو اس نے پسند کی تھی، وہ آپ کے سامنے جا کر گر پڑا اور جب اٹھا تو گھوڑے نے زمین پر ٹھوکر ماری جس سے پانی نکلنے لگا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسی جگہ حوض بنواؤ، چنانچہ اس نے اسی حکم کی تعمیل میں اس جگہ حوض کھدوایا تو پانی بہت ہی شیریں نکلا، یہ حوض دو پہاڑوں کے بیچ میں تھا، تمام شہر کو میٹھا پانی یہیں سے دستیاب ہوتا تھا، حوض کے بیچ ایک چبوترہ بنا ہوا تھا جس پر ایک عمارت بھی قائم تھی، شہر کے لوگ تفریح کے لئے اس پُر فضا مقام پر جمع ہوا کرتے تھے، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی روایت ہے کہ سلطان التمش کی وفات کے بعد لوگوں نے اس کو خواب میں دیکھا اور اس سے پوچھا کہ خداوند تعالیٰ نے تمہارے ساتھ کیا کیا۔ تو اس نے جواب دیا کہ میری بخشش میرے حوض کے بدولت ہوئی۔

اہم اطلاع: تمام باقی داران کو خطوط لکھے گئے اور جن کے ذمہ صرف ایک سال کا چندہ تھا ان کو وی پیاں بھیجی گئیں۔ جن حضرات نے خطوط کے جوابات نہیں دئے یا جنھوں نے وی۔ پی واپس کر دی بڑے افسوس کے ساتھ ہم ایسے تمام حضرات کے نام رجسٹر سے خارج کر رہے ہیں۔

ممکن ہے اتنے لمبے کام میں دفتر سے غلطیاں بھی ہوں لہٰذا اگر ایسے احباب کے نام کٹ جائیں جن کے نام نہیں کٹنے چاہئیں ان کو چاہئے کہ وہ فوراً دفتر کو اطلاع دیں تاکہ ان کا نام درج کیا جا سکے۔

(مینجر)

ندوۃ العلماء

منزل بہ منزل

قسط ۲

ندوۃ العلماء کا چوتھا اجلاس

منعقدہ۔ میرٹھ

خلاصۂ تقریر مولانا حبیب الرحمٰن خانصاحب شروانیؒ

حضرت صدر انجمن و اراکین ندوۃ العلما، و دیگر اعیان قوم!

سال گذشتہ کی طرح امسال بھی یہ عزت مجکو حاصل ہوئی ہے کہ جو رُوداد ابھی آپ نے سُنی ہے اس کے بابت اپنی رائے کا اظہار کروں، جناب ناظم صاحب نے ابتداءً جو حالات ان تجاویز کے نسبت کے بعد دیگرے صاف صاف ازراہ حق پسندی ظاہر کیا ہے کہ ان کے متعلق سال گذشتہ میں کوئی عملی کاروائی نہیں ہوئی، اس بیان سے یہ خیال نہ کیجئے کہ جب ہر تجویز کے بابت کاروائی کی نفی کان میں آتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ندوۃ العلماء سال میں ایک دفعہ غوغا مچا کر میٹھی نیند سوجاتا ہے اور جب سال آئندہ میں پورے بارہ مہینے ہو کر بیدار ہوتا ہے، تو ایک معذرت کا محضر قوم کے روبرو پیش کرتا ہے کہ افسوس ہے اس سال بھی کوئی عملی کاروائی نہیں ہو سکی، اور میں جو آپ کو اس خیال سے روکتا ہوں تو اس کے اسباب و اقعات ذیل ہیں:۔

دس لاکھ روپیے: اگر ان بزرگوں کو جو سال گذشتہ کے اجلاس میں تشریف فرما تھے، یہ توقع تھی کہ سال بھر بعد جب ہم سب پھر جمع ہوں گے تو جناب ناظم صاحب ہم کو یہ جانفزا مژدہ سنائیں گے کہ دارالعلوم اپنی عالیشان عمارت میں قائم ہو گیا اور اس کے سرمائے کے واسطے ہم دس لاکھ روپئے فراہم کر چکے مزید برآں دارالافتا بھی جاری کر دیا جس میں علامہ مفتی اپنے فرائض انجام ادا کر رہے ہیں، اور ہاں اشاعت الاسلام کے مقصد پورا کرنے کے لئے تمام ملک میں واعظ پھیلا دئے گئے تو مجکو افسوس ہے کہ ان کی یہ توقع پوری نہیں ہوئی بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ ہم ایسی توقع کو پورا نہیں کر سکتے اور اگر ان کو یہ امید تھی کہ سالِ آئندہ کو ہم یہ سنیں گے کہ ہم نے اپنے مقاصد کے حاصل کرنے کے واسطے فلاں فلاں تدبیریں کیں اور یہ کام کئے تو میں ان کو باور دلاتا ہوں کہ ان کی توقع کسی نہ کسی قدر پوری ہوئی ہے۔

حضرات! جتنے کام عظیم الشان ہیں ان کے واسطے لازم ہے کہ ان کا استحکام انکی شان کے لائق ہو، اگر ایک عظیم الشان مکان بنایا جائے جس کی شان کی رفعت اور صورت کی دلفریبی ناظرین کو متحیر کر دے مگر اس کی بنیاد بودی ہو اور متزلزل تو بجز اس کے کہ ایک روز اس کا بانی اس کی بربادی پر تاسف کرے اور کیا ہوتا ہے پس دارالعلوم ہو یا اشاعت الاسلام یہ کام نہیں ہو سکتے جب تک کہ تمام قوم سچے دل سے متفق و متوجہ نہ ہو، پس اول لازم ہے کہ ہم تمام تر اپنی قوت اس بارے میں صرف کریں کہ قوم کو ان کاموں پر آمادہ کریں۔

خلاصۂ تقریر مولوی شاہ محمد سلیمان صاحب پھلواری

اس وقت میں آپ کے حضور میں ندوۃ العلماء کے مقاصد پیش کرنے کو کھڑا ہوا ہوں، اگرچہ اس کے مقاصد شائع ہو چکے ہیں، مگر یہ جلسہ ہر سال نئے شہر میں ہوتا ہے نئے مہمان اس میں شریک ہوتے ہیں جن کو پہلے اس طرف زیادہ توجہ کرنے کا اتفاق نہیں ہوا اس کا بیان کرنا ضروری ہے۔

یہ بھی مقصود ہے کہ اس بیان کو سُنکر کسی صاحب کے خیال میں کوئی بات ندوے کے متعلق پیدا ہو اور وہ ہم کو نیک مشورہ دیں تو ہم اس کو شکریہ کے ساتھ قبول کریں۔

صلاح کا درخت خشک ہوگیا: حضرات! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایسی قوم میں مبعوث ہوئے جو جاہل اور سرکش تھی۔ آپ نے چند دنوں میں ان جاہلوں کو علم و حکمت سکھا دیا، گویا حضرت نے ایک باغ لگایا جس میں طرح طرح کے پھول پھل تھے، جن کی خوشبو مغرب میں اندلس کے پہاڑ تک پہونچی اور دوسری طرف دشتِ قبچاق تک۔ اس باغ کے مالی تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق، عمر فاروق، عثمان غنی، علی مرتضیٰ رضوان اللہ علیہم اجمعین اس باغ میں جو درخت نصب کئے تھے وہ صلاح فلاح تقویٰ، توبہ استغفار وغیرہ کے تھے، حضرت کے زمانے میں وہ باغ روز بروز تازہ ہوتا جاتا تھا حضرتؐ کے تشریف لے جانے کے بعد صحابہؓ اور ان کے سچے پیرووں نے اس باغ کو سینچ سینچ کر سیراب کیا یہاں تک کہ اس کے گلدستے تمام دنیا میں پہونچے ان بزرگوں کے اٹھ جانے سے رفتہ رفتہ وہ باغ ویران ہو چلا، آج صلاح کا درخت خشک ہو گیا یہاں تک کہ باد سموم کا ایسا جھونکا آیا جس سے اس باغ کی شادابی، سیرابی مٹ گئی، بلبلیں اڑ گئیں، نہ وہ ان کے چہچہے رہے نہ خوش الحانی۔

صاحبو! وہ باغ جس کی خدمت کرنے والے صحابہ کرامؓ تھے وہ علم کا باغ تھا اور اس کی بلبلیں علمائے کرام تھے جو تباہ خستہ حال پھرتے ہیں نہ وہ پھول و پھل نہ شادابی و سیرابی، جب آشیانہ ویران ہو گیا تو اب مارے مارے نہ پھریں تو کیا کریں۔

یہ شادابی کی فکر میں ہیں: اب تو آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ یہ اتنے علما دور دراز مقاموں سے آ کر کیوں جمع ہوئے ہیں۔ ایک پشاور سے آیا ہے تو دوسرا حیدرآباد سے یہ اسی باغ کے شاداب کرنے کی فکر میں ہیں۔

صاحبو! ہم لوگوں کی جمعیت اسی باغ کی سرسبزی سے ہے ہم فلک کی گردشوں سے واقف ہیں، خدا جانتا ہے جب زمانے کو دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ بدترین و جاہل ترین اقوام ہم ہیں۔ یہ اقرار ہم سب لوگوں کو ہے اور ہم کو اس کے ظاہر کرنے میں کچھ شرم نہیں کہ وہ باغ ویران ہو گیا اور ہمارے ہاتھوں سے ہوا، مگر اب بھی یہ امید ہے کہ اگر اس باغ کی سرسبزی کی فکر کی جائے گی تو وہ شاداب ہو جائے گا، لہٰذا یہ سوچ سمجھ کر ندوۃ العلماء کے نام سے یہ مجلس قائم کی گئی ہے۔

مگر صاحبو! یہ بات بھی خیال کرنے کی ہے کہ وہ باغ ویران ہوا تو اس کے کیا اسباب ہوئے۔ اس کے بیان کرنے کے لئے بہت وسیع وقت درکار ہے، مگر مختصر طور پر سمجھ لیجئے کہ ابتدا میں مسلمانوں نے جن اسباب سے ترقی کی تھی وہ ہم سے جاتے رہے۔ بہت بڑا سبب ہمارے عروج و ترقی کا صلاح و تقویٰ تھا وہ ہم سے بالکل جاتا رہا۔

ایک بیماری پیدا ہو گئی ہے جس کی ہم کچھ فکر نہیں کرتے وہ الحاد و دہریت ہے۔ الحاد و دہریت کا ایک دریا ہے جو امڈا چلا آرہا ہے اس لئے ہم لوگ جمع ہوئے ہیں کہ ان مصیبتوں سے بچنے اور پھر اس باغ کے سرسبز و شاداب کرنے کی کوئی راہ نکالیں اس لئے اس کا پہلا مقصد ترقی تعلیم ہے، یعنی دینی تعلیم نبوی کی ترقی۔

باہمی نفاق: دوسرا سبب اس باغ کی ویرانی کا نفاق باہمی ہے جو ہر فرقے میں پیدا ہو گیا ہے اس لئے دوسرا مقصد رفع نزاع رکھا گیا ہے جس کی ضرورت اس وقت میں نہایت ہی اہم ہے کہ مختلف دشمنان اسلام اپنا اپنا حملہ کر رہے ہیں۔

جلسۂ خاص اور اہم تجاویز: پہلے دن ناظم صاحب نے نصاب تعلیم کے مسئلے کو پیش کیا اور یہ بیان کیا کہ سال گزشتہ کے جلسے میں طے ہوا تھا کہ حضرت مولانا محمد لطف اللہ صاحب کی خدمت میں تمام کاغذات اور نقشے استصواب کی غرض سے بھیجدئے جائیں، چنانچہ اس کی تکمیل کی گئی اور حضرت مولانا نے اپنی رائے کے ساتھ ایک نصاب مرتب کر کے واپس فرمایا ہے اس کے بعد مدرگار ناظم نے مولوی اعظم حسین صاحب صدیقی خیرآبادی کا خط اور تجویزیں پیش کیں، اور ہر تجویز علیحدہ بحث ہو کر اس کا فیصلہ ہوا جو ذیل میں مندرج ہے:۔

۱۔ تجویز اول یہ تھی کہ دارالعلوم دہلی میں قائم کیا جائے، اگر وہاں نہ ہو سکے تو لاہور میں مولوی ابو محمد عبد الحق صاحب دہلوی نے شق اول کی تائید کی اور وجوہ ترجیح کو نہایت بسط و تفصیل

کے ساتھ بیان کیا، مولوی شاہ سلیمان صاحب نے اس سے اختلاف کیا اور کہا کہ دہلی ہمیشہ سے فتنہ وفساد کا گھر ہے ایسی جگہ دار العلوم قائم کرنا نامناسب ہے، دوسرے یہ کہ دار العلوم ایسے مقام پر قائم ہونا چاہیئے جس کے اطراف میں اہل خیر کثرت سے رہتے ہوں اور فراخ حوصلگی کے ساتھ مدد دے سکیں لہذا میرے نزدیک دار العلوم کے لئے لکھنؤ مناسب ہے، حاضرین میں سے بجز مولوی سلیمان صاحب کے سب نے دہلی میں دار العلوم قائم ہونے پر اتفاق کیا۔

سلف کی پیروی:

۲۔ دوسری تجویز یہ ہے کہ طرز نشست وطریقے میں صورۃً وسیرۃً ندوہ کو سلف کا پیرو ہونا چاہیئے اس کے نسبت بالاتفاق طے ہوا کہ ایسا ہی ہونا چاہیئے۔ اجلاس عام میں بھی یہ ضروری ہیں کہ علماء کی نشست کے لئے بلاضرورت کرسیوں کا اہتمام کیا جائے۔

۳۔ تیسری تجویز یہ تھی کہ کثرت روشنی کثرت آرائش اور تکلفات زائدہ میں جو روپیہ صرف کیا جاتا ہے وہ موقوف کیا جائے۔

۴۔ چوتھی تجویز یہ تھی کہ جو حضرات عقیدۃً اہل سنت وجماعت کے عقائد حقہ کے مخالف ہیں ان کی شرکت موقوف کی جائے۔

۵۔ پانچویں تجویز یہ تھی کہ جو علمائے ہندوستان ندوے میں شریک نہیں ہیں ان کے شریک کرنے کی کوشش کی جائے، اس کے نسبت فیصلہ ہوا کہ بیشک کوشش ہونی چاہیئے اور اب تک ندوہ اس سے غافل نہیں ہے اس کی جو تدابیر مولانا تجویز کریں اس کو عمل میں لانے کی کوشش کی جائے۔

اس کے بعد قاری محمد اسماعیل صاحب ساکن مٹیا محل دہلی نے یہ تجویز پیش کی کہ دار العلوم کے قائم ہونے سے پہلے اس بات کی کوشش کی جائے کہ والیان ملک دار العلوم کے سند یافتہ طالبعلموں کو اپنی اپنی ریاست میں عہدے دینے کا وعدہ کرلیں، اس سے روساء کو لائق اور متدین عہدہ دار میسر آئیں گے اور عام طور پر مسلمانوں کو دار العلوم سے کامل ہمدردی پیدا ہو جائے گی۔ اور ان کی اولاد اس سے مستفید ہوگی۔

خلاصۂ تقریر مولوی قاضی ابوبکر علی احمد محمود اللہ شاہ صاحب بدایونی

حضرات حاضرین! میں یہ تجویز پیش کرتا ہوں کہ انگریزی خواں طلبہ کو وظیفہ دے کر عربی پڑھائی جائے۔

انگریزی داں کو دینی تعلیم:

میں اس قابل نہیں ہوں کہ اپنے کو علماء میں شمار کروں مگر چونکہ مجھے اس وقت جلسۂ علماء میں نشست کی عزت حاصل ہوئی ہے اس واسطے کہتا ہوں کہ ہم لوگ جو علماء ہیں وہ انگریزی پڑھ نہیں سکتے ہیں، خود کہتا ہوں کہ انگریزی کی بہت ضرورت ہے مگر مجھے پڑھنے میں تکلف دعار ہے۔ عیسائیوں کے مسلمانوں پر اعتراضات طبع ہوکر یورپ و ہندستان میں شائع ہوتے ہیں مگر ہم لوگ انگریزی کے نہ جاننے سے جواب نہیں دے سکتے اور جواب کیا دیں یہ بھی نہیں جانتے کہ کسی نے اعتراض بھی کیا ہے اس طرح کی لاعلمی اور خاموشی سے وہ سمجھتے ہیں کہ اعتراضات تسلیم ہوگئے دوسرے ملکوں میں جہاں انگریزی زبان رائج ہے جاکر اشاعت اسلام نہیں کر سکتے، جو مسلمان انگریزی خواں ہیں وہ یا تو عربی بالکل نہیں جانتے یا کم جانتے ہیں اور دینی امور سے بہت ہی کم واقف ہوتے ہیں۔

مولوی قاضی علی احمد محمود اللہ شاہ صاحب یہ تقریر کرکے بیٹھے تو مولوی عبد اللہ صاحب انصاری داماد مولانا محمد قاسم صاحب علیہ الرحمۃ نے کھڑے ہوکر مذکورہ بالا تحریک کی تائید فرمائی اور وہ تحریک جیسا کہ پیش ہوئی تھی بالاتفاق منظور ہوئی، اس کے بعد مولانا شبلی صاحب نعمانی کھڑے ہوئے اور دار العلوم پر ایک بسیط اور اعلیٰ درجے کی تقریر کی جو تقریباً ڈیڑھ گھنٹے میں تمام ہوئی اس کا ہر ہر فقرہ بلکہ ہر ہر حرف نقش کالحجر کی طرح سامعین کے قلوب پر بیٹھا جاتا تھا اور ہر شخص جوش اور فرط انبساط سے محو حیرت ہوگیا تھا، مگر افسوس ہے کہ اپنی عادت کے موافق فاضل مقرر نے یہ تقریر پہلے سے قلمبند نہیں کی تھی اور بعد میں جو لکھ کر بھیجی وہ تلف ہوگئی۔

ان کے بعد مولوی ناظر حسن صاحب دیوبندی مدرس اول مدرسۂ عبدالرب مرحوم دہلی نے نہایت عمدگی سے اس موضوع پر تقریر فرمائی کہ اسلام کی ترقی کیوں کر ہوئی اور کیونکر ہونی چاہیئے، اس تقریر میں مولانا نے اس بات کو ثابت کیا کہ ابتداء میں مسلمانوں نے جو کچھ ترقی کی ہے وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی سے ہے۔ اور اب اگر وہ ترقی کر سکتے تو اسی کی بدولت کر سکتے ہیں۔ آخر میں مولانا نے ظاہر کیا کہ ندوۃ العلماء کے قائم ہونے سے ہم کو بہت خوشی ہوئی۔

ضروری اطلاع

مسلسل درخواست کے باوجود بعض حضرات منی آرڈر کوپن پر اپنا پورا پتہ اور خریداری نمبر تحریر نہیں فرماتے جس کی وجہ سے سخت دشواری پیش آتی ہے۔ اسی طرح کے مندرجہ ذیل منی آرڈر وصول ہوئے مگر کہیں جمع نہ کئے جا سکے:۔

Rs. 6/-	ششماہی چندہ کا پیغام ہے نام نہیں۔
Rs. 24/-	عبدالکریم کیرالوی۔ مکمل پتہ نہیں
Rs. 12/-	محمد صدیق بنگال۔ مکمل پتہ نہیں
Rs. 12/-	مولانا سید مکرم حسین صاحب۔ مکمل پتہ نہیں
Rs. 12/-	پیغام ہے نام میں کسی طرح برکات احمد پڑھا جاتا ہے۔
Rs. 12/-	خریداری نمبر 1667 لکھا گیا ہے جو غلط ہے، نام فضل الرحمٰن پڑھنے میں آتا ہے۔

مندرجہ بالا حضرات سے درخواست ہے کہ وہ اپنا نام و پورا پتہ اور اگر پرانے خریدار ہیں تو خریداری نمبر تحریر فرمائیں۔

مولانا عبدالماجد ــــــ حیات وخدمات

مولانا عبدالماجد دریابادی کے متعلق پیامات ومضامین کا مجموعہ۔ شائع کردہ: عبدالماجد اکاڈمی اس کی آمدنی مولانا مرحوم کی یادگار کے قیام پر صرف ہوگی۔ قیمت: ۵ روپیہ۔ قیمت کے ساتھ محصول رجسٹریشن ۲ روپیہ ۷۰ پیسے ارسال کی جائے۔

وی۔ پی میں محصول تین روپیہ سے بھی زائد پڑ جاتا ہے۔

عبدالماجد اکاڈمی۔ ۸۔ کچہری روڈ۔ لکھنؤ

"تعمیر حیات" میں اشتہار دیکر
اپنی تجارت کو
فروغ دیجئے۔

پرنٹر پبلشر، مسئول سید محمد حسنی نے جے۔ کے آفسیٹ پرنٹنگ پریس دہلی میں طبع کرا کر دفتر "تعمیر حیات" ندوہ لکھنؤ سے شائع کیا۔

اڈیٹر: اسحٰق جلیس ندوی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دار العلوم ندوۃ العلماء
خدمات اور ضروریات

الحمد للہ رب العٰلمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین
سیدنا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین

دار العلوم ندوۃ العلماء محتاج تعارف نہیں ہے۔ اس کے قیام کو ۹۰ برس ہوگئے ہیں، خدا کا شکر ہے کہ اس اثناء میں اس نے گرانقدر علمی اور دینی خدمات انجام دی ہیں۔ تصنیف وتالیف، درس وتدریس، پند ومواعظ غرض ہر شعبہ میں اس کے فرزندوں اور سرپرستوں نے قابل قدر کام کئے ہیں، خوش قسمتی سے تقریباً بیس برس سے حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی اس کو توجہ اور سرپرستی حاصل ہے، جن کے دور نظامت میں اسکی شہرت دنیا کے گوشہ گوشہ میں پہونچ چکی ہے اور بجا طور پر آج وہ ایک عظیم اسلامی مرکز بن گیا ہے نیز اس نے ایک بین الاقوامی دینی درسگاہ کی حیثیت اختیار کرلی ہے، اللہ تعالیٰ کا شکر واحسان ہے کہ اس نے تعلیمی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ ندوہ کو دینی روح اور دعوتی جذبہ سے بھی نوازا ہے، سالہا سال سے اسلامی تعلیمات کی نشر واشاعت اور دینی زندگی کے فروغ کے لئے اس کے طلبہ، اساتذہ اور کارکنان بڑی سرگرمی سے کوشاں ہیں، تبلیغ ودعوت کی جانب خاص طور سے متوجہ ہیں (طلبہ اپنے تعلیمی مشاغل اور علمی وثقافتی سرگرمیوں کیساتھ ساتھ جو ندوۃ العلماء کا ہمیشہ سے طرۂ امتیاز رہا ہے، دینی زندگی میں بھی ممتاز ہیں) جناب ناظم صاحب ندوۃ العلماء کی فکری رہنمائی اور عملی نگرانی میں وہ علم دین کے مراحل بڑی خوبی وخوش اسلوبی سے طے کر رہے ہیں، ان علمی وروحانی مشاغل میں انہماک کے ساتھ طلبہ کی صحت وورزش، خورد ونوش وغیرہ کی جانب بھی خصوصی توجہ کیجا رہی ہے۔

اس وقت دار العلوم ندوۃ العلماء میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کے علاوہ ملیشیا، انڈونیشیا، تھائی لینڈ، جنوبی افریقہ، ترینداد، یوگنڈا اور دوسرے ممالک کے طلبہ بھی زیر تعلیم ہیں، مختلف ملکوں سے برابر داخلے کی درخواستیں آتی رہتی ہیں، اللہ کے فضل سے عرب ممالک میں ندوہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، اندرون وبیرون ملک کے مسلمانوں کی توجہ اس کی تعلیم وتربیت سے استفادہ کی خواہش روز افزوں ہے۔ ان اسباب کی بناء پر داخلوں کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا ہے، جس کی وجہ سے مزید نئی اقامت گاہوں کی بیحد ضرورت ہے اس کے علاوہ دار العلوم کے مختلف شعبوں مثلاً دفاتر، دار الحفظ، لائبریری وغیرہ کے لئے علیحدہ مستقل عمارتیں درکار ہیں، انہی ضروریات کو سامنے رکھ کر مدرسہ ثانویہ کی نئی عمارت (جس کا نام اب معہد دار العلوم ہے) کی تکمیل تیزی کیساتھ ہو رہی ہے اس کا تعمیری کام اختتام کے قریب ہے، اسی کے ساتھ اللہ کا نام لے کر طلبہ کی نئی اقامت گاہ "رواق اطہر" کا سنگ بنیاد ۱۲ مئی ۱۹۸۴ء کو رکھدیا گیا اور اب الحمد للہ کہ اس کی تیسری منزل زیر تعمیر ہے۔

"معہد دار العلوم" میں جس کو ایک معیاری مدرسہ ثانویہ بنایا جا رہا ہے باوجود وسعت کے گنجائش ختم ہو چکی ہے اور امسال کثیر تعداد میں طلبہ کو واپس کیا گیا ہے اسی طرح دار العلوم میں بھی بہت سے داخلے محض انہی مجبوریوں کی بناء پر نہیں کئے جا سکے، یہ صورت حال ندوۃ العلماء دار العلوم کے لئے باعث فکر ہے اور محض جگہ کی تنگی کی وجہ سے شائقین علم دین کو واپس کرنا نیز مقیم طلبہ کی بڑھتی ہوئی دشواریاں اور ضرورتیں ان کی فکر وبے چینی میں مزید اضافہ کا باعث ہیں، علاوہ ازیں عمارتوں اور ضروری تعلیمی سامان کی کمی کی وجہ سے بہت سے مفید علمی ودینی منصوبے پوری توجہ اور یکسوئی کے محتاج رہتے ہیں۔ ہماری خواہش اور درخواست ہے کہ آپ میں سے جن حضرات کو اللہ تعالیٰ توفیق دیں اور سہولت ہو وہ اپنی تشریف آوری سے حسب موقع ہمیں سرفراز فرمائیں خود آکر ان نونہالان چمن کو دیکھیں، ان کی ضروریات کو سمجھیں، فی الوقت جو کام شروع کئے جا چکے ہیں یا مستقبل قریب میں فوری توجہ کے مستحق ہیں ان کی تفصیل درج ذیل ہے:۔

رواق اطہر

طلبہ کی یہ اقامت گاہ (ہوسٹل) زیر تعمیر ہے۔ یہ عمارت انشاء اللہ سہ منزلہ ہوگی ہر منزل میں بیس کمرے ہوں گے اور ہر کمرے میں چار سیٹیں ہوں گی اس طرح پوری عمارت ساٹھ کمروں پر مشتمل ہوگی اور دو سو چالیس طلبہ اسمیں قیام کر سکیں گے اس عمارت میں دو بڑے ہال بھی ہوں گے جو طلبہ اور دار الاقامہ کی علمی وثقافتی ضروریات میں کام آسکیں گے۔

معہد دار العلوم

معہد دار العلوم (یا مدرسہ ثانویہ) یہ عمارت فی الوقت دو منزلہ ہے اسمیں ۲۴ کمرے اور دو ہال ہیں۔ اس عمارت کے دونوں ہال فی الوقت چھوٹے بچوں کی رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہو رہے ہیں (اس عمارت کے دونوں بازوؤں کو سائیکل اسٹینڈ اور وضو خانہ کا خوبصورت شیڈ ملا ہے) چھوٹے بچوں کی نماز باجماعت ایک ہال میں ہوتی ہے، اس عمارت کی تیسری منزل بھی زیر تعمیر ہے۔

اسٹاف کوارٹرس

حضرات اساتذۂ کرام کے لئے رہائشی مکانات کی ہمیشہ ضرورت رہتی ہے، فی الوقت چار مکانوں کی بنیاد ڈال دی گئی ہے اور تعمیری کام کا آغاز کردیا گیا ہے۔ یہ مکانات دو منزلہ ہوں گے